# ٹھنڈا میٹھا پانی

خدیجہ مستور

# ٹھنڈا میٹھا پانی

35588

خدیجہ مستورؔ

کتب خانہ
داخلہ نمبر
تاریخ
ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۵

نیاز احمد نے
زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

تعداد ـــــ ایک ہزار
قیمت ۔/۹۹ روپے

ISBN - 969 - 35 - 0563 - 8

ظہیر بابر کے نام

کتب خانہ
داخلہ نمبر
تاریخ
ادارہ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد دکن
35588

# ترتیب


1- خرمن 7

2- راستہ 34

3- بھورے 49

4- ثریا 65

5- سودا 74

6- سہرا 93

7- فیصلہ 109

8- ٹھنڈا میٹھا پانی 145

9- بھروسا 132

# خرمن

کنیز کوٹھری کے ایک کونے میں سر نیہوڑائے بیٹھی تھی اور دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے جا رہی تھی۔ اس کے پاس اماں کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور اسے گھور گھور کر دیکھے جا رہی تھی۔ کنیز نے ایک بار سر اٹھا کر بے بسی سے ماں کو دیکھا اور پھر گھٹنوں میں منہ چھپا لیا۔

"سوچ لے ری، ہاں کہنا بڑا آسان ہے۔ چھ مہینے بعد جب واپس آئے گی تو دنیا یہی کہے گی کہ تیری ماں نے کھسم کیا، بہت برا کیا، کر کے چھوڑ دیا اس سے بھی برا کیا، مجھ بڑھیا کی "جندگی" کیوں کھراب کرنے کی سوچ رہی ہے۔"

"اتنے دن تو گھر بیٹھوں گی اماں ری——" کنیز منمنائی۔ "دنیا تو اب بھی جانے کیا کیا کہتی ہے، کوئی پتہ ہے میں مڑ کر نہ آوں۔"

"مڑ کر نہیں آنے کی تو پھر کہاں جائے گی ری؟" اماں نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"جباب دے اماں، دیری ہو رہی ہے۔" دین محمد نے صحن میں کھڑے کھڑے آواز لگائی۔ ستمبر کی دھوپ کھوپڑی چٹکائے دیتی تھی۔ "بن باپ کی لڑکی ہے چھ مہینے تو مجھے سے کھائے پئے گی۔" دین محمد کی آواز بہت اونچی تھی۔

"کہیں چلی جاؤں گی اماں، تو اسے جباب تو دے دے، کب کا کھڑا ہے۔" کنیز نے بے چینی سے کہا۔

"تو میری ناک کاٹنے پر ادھر ہی آئے گی، پھر جائے گی کہاں؟ باؤلی، ایسی جگہ بیٹھ جہاں سے مڑ کر نہ آئے، اتنے کو کھسم بنایا پر کسی کے گھر نہ ٹک گئی۔"

"تجھ سے جو کہا ہے، کہہ دے جا کر کہ منجور ہے، بے سک کل آ کر سادی

کر لے۔" کنیز جیسے بلبلا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر دھم سے بیٹھ کر اور ٹانگ میں پھنسے ہوئے چوڑی دار پاجامے کو کھسکا کر پنڈلی کھجلانے لگی۔

"حرا مجادی کس کی سنتی ہے۔" اماں بڑبڑاتی اور گالیاں بکتی کوٹھری سے نکل گئی۔۔۔ مجھے منجور ہے رے دین محمد!" اس نے چیخ کر اعلان کیا۔

کنیز دوڑ کر کوٹھری کے دروازے سے جا لگی اور باہر صحن میں جھانکنے لگی جہاں کھڑا ہُوا دین محمد اپنا صافہ ٹھیک سے باندھ رہا تھا۔

"اچھا اماں میں چلا، کل کو آؤں گا، تیار رکھیو۔" وہ پگڑی سر پر جماتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

کنیز کوٹھری سے نکل آئی۔ سامنے صحن کا دروازہ اب تک کھلا تھا۔ وہ گم سم سی ادھر دیکھنے لگی۔ "کل بچی مچی تیری سادی ہو جائے گی ری ..کنیج۔" وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

"تل کوٹ کر تھوڑے سے لڈو بنا لے۔ کل جو تیرا کھسم آئے گا تو اسے کیا دوں گی؟" ماں نے کڑوی کڑوی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو کس کارن کھار کھا رہی ہے اماں۔" کنیز نے چمک کر جواب دیا اور پھر کوٹھری میں جا کر مٹکی سے تل نکالنے لگی۔

ماں کچھ کہے بغیر باہر چلی گئی اور کنیز تل کوٹنے بیٹھ گئی۔ "اگر ابا جندہ ہوتا تو ایک دن تیری سادی بھی عجت کے ساتھ ہو جاتی ری، جب عجت نہیں رہی تو تجھ سے سادی کون کرتا۔" کنیز نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کھیر کوئی بات نہیں، تھوڑے دن تو عجت کے ساتھ گھر بیٹھ کر گجر جائیں گے۔" کنیز نے جیسے اپنے آپ کو سمجھایا۔

آج اسے بڑی مدت بعد جانے کیوں ابا بار بار یاد آ رہا تھا اور اس کی موت کی ذرا ذرا سی تفصیل اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہی تھی۔

اس دن جب ابا مزدوری کر کے واپس آیا تو بکری کے لئے ہریالی لانا بھول گیا تھا۔ ایک گلاس پانی پی کر فوراً" ہی چلا گیا۔ ماں روکتی بھی رہی کہ "مت جارے، بادل گھرے کھڑے ہیں۔ کپڑے بھیگ جائیں گے، رات ویسے بھی گجر جائے گی۔" پر ابا نے اس کی بات نہ سنی اور چلا گیا۔ پھر کنیز روٹیاں پکا کر انتظار

کرتے کرتے تھک گئی مگر ابا نہ آیا' رات آگئی' بڑے زور سے بارش ہونے لگی تھی- باہر گھور اندھیرا تھا اور بڑے زور سے بجلی چمک رہی تھی- ماں بے چین ہو کر بار بار بارش میں بھیگتی ہوئی باہر کے دروازے تک جاتی اور پھر لوٹ آتی- کنیز بار بار ماں کو تسلی دیتی کہ "بارس میں بھیگنے کے ڈر سے کہیں درکھت تلے بیٹھا ہوگا-" اس طرح اور بھی وقت گزر گیا- بارش رک گئی مگر ابا درکھت تلے سے نہ اٹھا- تب وہ اماں کے ساتھ ابا کو دیکھنے نکل کھڑی ہوئی- دیا جلا کر اس نے پلو کی آڑ میں چھپا لیا تھا اور کیچڑ میں سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتی قریب کے جنگل کی طرف جا رہی تھی- ہوا دیے کی روشنی کے ساتھ دشمنی پر اتری ہوئی تھی مگر کنیز نے اسے بجھنے نہ دیا اور ایک ایک درخت تلے گھور گھور کر دیکھتی چلی گئی- پھر ایک درخت تلے اس نے دیکھا کہ ابا بڑے آرام سے لیٹا ہے- اس نے ابا کو آوازیں دی مگر وہ نہ اٹھا- ہریالی کا گٹھا اس کے قریب پڑا تھا اور درخت کے پتوں سے بوندیں ٹپ ٹپ اس کے کپڑوں پر گر رہی تھیں- ماں نے دیے کی روشنی میں غور سے دیکھا تو ابا کے منہ سے ہرا ہرا جھاگ بہہ رہا تھا اور انگلی پر خون کی دو بوندیں بڑی تازہ لگ رہی تھیں- "اری اسے تو سانپ ڈس گیا ہے-" ماں کلیجہ پھاڑ کر رونے لگی-

کنیز نے موسل زور سے پٹک دیا اور اوکھلی سے تل نکالنے لگی- "جانے کتنا جہر بھرا ہوگا- انہی تلوں کی طرح کالا ہوگا ری-" کنیز کو وہ تل لہراتے ہوئے سانپ معلوم ہو رہے تھے- "اری تجھے نہ ڈس گیا- تیرا کیا کام تھا اس دنیا میں' ابا جندہ ہوتا تو کچھ کما کر لاتا' ماں کو عجت سے بٹھاتا- تو نے کیا کمایا ری' سب کچھ لٹا دیا- بھوک جالم نے کچھ بھی نہ چھوڑا-"

اور پھر کنیز کو یاد آیا کہ بھوک نے اسے کتنی جلدی بے ایمان بنا دیا تھا- ابا کے مرنے کے دوسرے دن شام کو جب بکری سینگ تانے گھر میں داخل ہوئی تو وہ لٹیا لے کر دوڑ پڑی تھی اور دودھ دوہ کر آدھے سے زیادہ خود پی گئی تھی اور آدھے سے کم اماں کو دیا تھا' پھر بھی رات تڑپ کر گزری تھی- مارے بھوک کے ایک منٹ کو بھی نیند نہ آئی تھی اور وہ منہ اندھیرے چپکے چپکے اٹھ کر بکری کا دودھ

دوہ کر پی گئی تھی۔ ساری رات کی روئی ہوئی اماں صبح بے خبر سو رہی تھی۔ دن چڑھے جب وہ اپنی کھاٹ پر سے اٹھی تو بکری کے تھن خالی تھیلیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ کنیز نے گھنٹوں تھنوں کو سہلایا تھا تو کہیں جا کر آدھا پاؤ دودھ اترا تھا۔ اماں اتنا سا دودھ دیکھ کر بلبلا اٹھی تھی۔ "اس ناس ماری کو کسی کھائی کے ہاتھ بیچ دے ری، یہ بھی ساتھ چھوڑ گئی۔" اور کنیز نے بڑی مکاری سے کہا تھا کہ "اماں ساید یہ گیا بھن ہو گئی ہے، اللہ کرے گا دوسری بکری آ جائے گی، اسے بیچ کر کتنے دن روٹی چلے گی۔"

شام کو جب چراگاہ سے واپس آئی تو تھن بھرے ہوئے تھے کہ بھوری بھوری کھال چٹختی معلوم ہو رہی تھی۔ دو تین دن میں اماں پر راز کھل گیا تھا کہ بکری گیا بھن نہیں اور وہ خوب چیخی تھی کہ "حرام جادی "گیا بھن تو تو ہو گئی ہے۔ اری چار دن پیٹ کابو میں نہ رکھا، اتنے میں کرائے تیرے ابا نے اور اب چاہتی ہے کہ تیرا پیٹ بھرنے کے لئے ابھی سے مجوری سروع کر دوں، مرنے والے کی عجت کھاک میں ملا دوں۔ برادری بھی کہے گی کہ کچھ نہ چھوڑ مرا۔"

"بڑے عیس کئے تھے۔" کنیز بڑبڑا اٹھی تھی۔ "روج روج باجرے کی روٹی اور دھنیے کی چٹنی، بہت ہوا تو گڑ کی بھیلی مل گئی، اب عجت لے کر بیٹھی رہ، مجوری کئے بگیر پیٹ بھرنے سے رہا۔" کنیز نے ماں کو سمجھایا تھا۔

ماں سر جھکا کر کچھ سوچنے بیٹھ گئی تھی۔ "پر میں تو گٹھیا کی ماری ہوں مجھ سے مجوری کیسے ہو گی ری، اور تو کرے گی تو تیرے ابا کی روح کیا کہے گی؟"

"لے بھلا روحیں بھی کبھی کچھ کہنے آتی ہیں اماں، تو پھکر نہ کر، میں تیری کھدمت کروں گی۔" اور پھر دوسرے دن سے کنیز محنت مزدوری کرنے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

"توبہ توبہ اللہ ماپھی دے۔" کنیز اوکھلی سے تل نکالتے ہوئے بڑبڑائی اور پھر سوچتی چلی گئی ——— بن باپ کا جان کر جگ نے کتنا ستایا ساروں نے، اپنی عورت سمجھ لیا پر ایک نے بھی گھر نہ بٹھایا۔ جالم مار کر پانی بھی نہ دیتے اور توبے سرم پھر بھی تلیا میں نہ ڈوب مری۔ یہ جندگی بھی کیسی ہیجیج ہوتی ہے، اپنے ہاتھوں نہیں لی

جاتی رہی۔" کنیز نے ٹھنڈی سانس بھری اور دو آنسو ٹپ سے تلوں پر گر کر جذب ہوگئے۔ "رے دین محمد تو یہ لڈو کھائے گا' اس میں کنیج کے آنسو ملے ہیں' چھوڑیو نہ رے' تجھے ان آنسوؤں کی کسم!"

کنیز نے گھٹنوں میں منہ چھپالیا اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی مگر جب اماں جلانے کی لکڑیاں چن کر اندر آئی تو وہ آنسو پونچھ کر اس طرح آگ جلانے بیٹھ گئی جیسے ذرا دیر پہلے روئی ہی نہ تھی۔

اب شام ہونے لگی تھی۔ وہ چولہے پر چھوٹی سی کڑھائی چڑھا کر لڈو بنانے لگی۔ اس کی اماں نیم تلے کھاٹ ڈال کر بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے ماتھے کی شکنیں بڑی گہری ہو رہی تھیں۔

"اماں اداس نہ ہو۔ میں تیرا کھیال رکھوں گی' سال سے جیادہ کا اناج تو کوٹھری میں بھرا ہے' تیری اکیلی جان ہے۔" کنیز نے کڑھائی اتارتے ہوئے کہا۔

"تو اپنی پھکر کر ری' میرا کیا ہے۔" ماں نے دھیرے سے کہا اور پھر المونیم کی لٹیا اٹھا کر باہر چلی گئی۔

لڈو بنا کر کنیز مسافروں کی طرح صحن میں ٹہلنے لگی۔ برسات میں جمی ہوئی کائی کے اب سوکھ سوکھ اکھڑ چلے تھے' کچی دیواروں پر شورا پھول رہا تھا اور نیم کا درخت خوب ہرا بھرا ہو رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ برسات میں ابا اس درخت میں جھولا ڈال دیتا تھا اور وہ لڑکیوں کو جمع کر کے گھنٹوں جھولا جھولا کرتی تھی۔ شادیوں کی باتیں ہوتی تھیں اور ساس سے جلن کا اظہار کرتے ہوئے سب کی تیوریوں پر بل پڑ جاتے تھے۔

کنیز ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی کھاٹ پر لیٹ گئی۔ "اری کنیج! تیری ہی کسمت کھراب تھی' ساری لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ ان کی سادیوں میں کھوب ڈھول بجی' تماسے ہوئے' دولہے سہرے باندھ باندھ کر آئے تھے۔ ایک تیری سادی ہوگی' اپنے ہاتھوں لڈو بنا کر بیٹھی ہے۔ تو کیا ہے ری اور تیری سادی کیا ری؟ ڈھول بجانے کون آئے گا۔ اماں تو سب سے چھپاتی پھرتی ہے' کسی کو پتہ نہ چلے کہ چھ مہینے کے لئے سادی ہو رہی ہے۔" وہ نیم سے جھڑی ہوئی پتیاں دوپٹے

پر سے اٹھا کر مسلنے لگی۔

مغرب کا وقت ہو رہا تھا نہ اماں باہر سے لوٹی اور نہ کنیز کھاٹ سے اٹھی۔ اس وقت اسے بد نصیبی کے احساس کو جگانے اور رونے میں بڑا سکون مل رہا تھا۔ بکری جب سے آئی تھی صحن میں کھلی پھر رہی تھی اور ہر جگہ مینگنیاں بکھیر رہی تھی مگر کنیز کا جی نہ چاہا کہ اٹھ کر اسے باندھ دے۔

اماں نے گھر میں داخل ہوتے ہی یہ منظر دیکھا تو منہ ہی منہ میں جانے کیا کچھ کہنے لگی۔ پھر بکری کو باندھ کر دودھ دوہا اور آنگن سے مینگنیاں بٹورنے بیٹھ گئی۔

رات کچی کچی نیند میں کٹ گئی۔ آج صبح مزدوری کے لئے جانے کے بجائے وہ ماں کے ساتھ جنگل جا کر واپس آ گئی۔ جھاڑو اٹھا کر اس نے کوٹھری اور آنگن جھاڑا۔ پھر دو کھاٹیں نیم تلے بچھا دیں۔ اپنے حساب وہ براتیوں کے بیٹھنے کا انتظام کر رہی تھی مگر نظریں باہر کے ادھ کھلے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ "بس اب آتا ہی ہوگا وہ' کہیں نہ آیا تو؟" مارے شبہے کے کنیز کا دل بیٹھنے لگا۔ "اری اس گاؤں میں تو کوئی تجھ سے چھ مہینے کے لئے بھی سادی نہ کرے گا۔" ماں کوٹھری کی دہلیز پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ کنیز ہاتھ دھو کر اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"میں تیرا کھیال رکھوں گی اماں ری!"

"چپ رہ حرام جادی!" ماں نے جھنجھلا کر کہا اور پھر گھٹنوں میں سر چھپا کر رونے لگی۔ "جو تو ایسی نہ ہوتی تو آج اپنی برادری میں عجت کے ساتھ بیاہ جاتی۔ اپنا گھر' اپنا گاؤں ہوتا۔ چھ مہینے بعد پھر بے عجت ہو کر آ جائے گی۔" اماں آنسو پونچھ کر اٹھ گئی اور کوٹھری میں جا کر سرخ پھولوں والے پرانے بکس میں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

کنیز جیسے کلیجہ تھامے وہیں کھڑی رہی۔ اس نے پہلے بھی اپنے لئے دوسروں سے اور خود اپنی ماں سے جانے کیا کچھ نہ سنا مگر اسے اتنا برا نہ لگا تھا۔ پر آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر کہے کہ وہ ایسی نہیں۔ وہ تو ہمیشہ سے گھر اور عزت کے لئے تڑپتی رہی تھی۔

"لے یہ تیرے باپ نے تیرا جوڑا بنایا تھا' نہا کر پہن لے۔ وہ کہہ گیا تھا کہ

نہ کچھ لانا ہے نہ لینا ہے' پھر کن جوڑوں کے انتجار میں بیٹھی ہے۔" اماں نے جاپانی کیلے کا سرخ پھولدار جوڑا اس کی طرف بڑھا دیا اور پھر مٹکی سے چاول اور گڑ کی بھیلی نکال کر سوپ میں رکھنے لگی۔

"اماں کھا مکھا جان نہ جلا۔ تو نہ ڈر ری' میں واپس نہیں آنے کی۔" کنیز نے کپڑے بغل میں دبا لئے۔ "آ لینے دے' پھر پہن لوں گی' تو ہمکر نہ کر۔" جوڑا کھاٹ پر رکھ کر وہ صحن میں چلی گئی۔ پانی کا گھڑا اٹھا کر نیم کے پاس رکھا اور پھر کھاٹ کھڑی کر کے اس کی آڑ میں نہانے بیٹھ گئی۔ نہانے کے بعد اس نے کھاٹ بچھا دی اور کوٹھری میں جا کر میلے دوپٹے سے بال پونچھنے لگی۔ اماں اب تک دہلیز پر بیٹھی ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھی۔ جانے اس وقت وہ کیا کیا سوچ رہی تھی۔ شاید یہی کہ سردیاں آنے والی ہیں۔ اس کے جوڑوں کا درد جاگ اٹھے گا۔ وہ اس گھر میں اکیلی کھاٹ پر پڑی کراہا کرے گی' کوئی اس کے جوڑوں پر سرسوں کا تیل ملنے والا نہ ہوگا۔ کوئی ایک گلاس پانی دینے والا نہ ہوگا۔ آج اگر اس کی کنیز اپنی برادری میں' اپنے گاؤں میں بیاہی جاتی تو وہ اسے سردیوں کے سردیوں سسرال سے بلا لیا کرتی اور جانے کیا کیا۔

"اماں یوں چپ چاپ نہ بیٹھ۔" کنیز نے بال پیچھے جھٹک کر دھیرے سے کہا۔ اس کی نظریں آنگن کے ادھ کھلے دروازے کے پار دین محمد کی راہ تک رہی تھیں۔

ابھی اچھی طرح دھوپ نہ چڑھی تھی کہ دین محمد چار آدمیوں کے ساتھ آ گیا۔ اماں نے آگے بڑھ کر ان کو کھاٹوں پر بٹھایا اور خود ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ "بہت صبح چلے ہوگے' پھر دھوپ کڑی ہو جاتی ہے' راستے میں تکلیف تو نہیں ہوئی تھی۔"

"کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اب تم جلدی کرو اماں' دھوپ چڑھنے سے پہلے نکل کھڑے ہوں' تین کوس کا راستہ ہے۔" دین محمد نے آہستہ سے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں سے باتیں کرنے لگا۔

"لے اتنی صبح صبح آ گیا' چین نہیں پڑا تجھے رات کو۔" کنیز نے دل میں کہا۔

وہ خوشی سے جیسے باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔ گاؤں والوں کو جب مالوم پڑے گا کہ کنیز بیاہ کر چلی گئی تو کیسا پانی پڑ جائے گا سب پر۔" اس نے جلدی سے پھولدار کپڑے بدل لئے، تین موتیوں والی پتیل کی نتھ ناک میں ٹھونس لی اور پڑیا سے لال رنگ ہونٹوں پر ملتے ہوئے جب اس نے شیشہ دیکھا تو اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ "ہے ری کنیز، اس وکھت ڈھول بجانے والیاں پاس ہوتیں تو پھر کیسا مجا آتا۔" وہ بڑبڑائی۔

گواہ کوٹھری کے دروازے کے پاس کھڑے ہوگئے اور کنیز نے اتنے زور سے "ہوں" کی کہ سب نے سن لی۔ اماں ایک بار کھڑے سے بیٹھ گئی اور پھر لڈوؤں کی تھالی اٹھا کر کوٹھری سے نکل گئی۔

لڈو کھلانے کے بعد جب اماں اندر آئی تو اس نے سوپ میں رکھے ہوئے چاول اور گڑ کی بھیلی کنیز کے پلو میں باندھ دیئے۔ "لے اب اٹھ، جانے کا وکھت ہوگیا ہے۔"

کنیز ذرا دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی، اس وقت اس کا جی دکھ رہا تھا—— یہ کیسی شادی ہے کہ کوئی رخصت کرنے والا بھی نہیں اور پھر چھ مہینے کا کھٹکا جی کو ڈسے جاتا ہے—— وہ پلو میں بندھے ہوئے چاول سنبھال کر کھڑی ہوگئی۔ "اماں کسی کو پتہ نہ چلے کہ میری سادی چھ مہینے کے لئے ہوئی ہے۔"

"ایسا ہی ڈر پڑا تھا تو پہلے سوچتی ری، جب آئے گی تو سب کو نہ مالوم ہوگا؟" اماں کی آواز بھرا رہی تھی۔ "لے اب چل۔"

اماں کنیز کا بازو تھام کر اسے باہر آنگن میں لے آئی تو دین محمد اور اس کے ساتھی کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے اماں کو سلام کیا اور جلدی سے باہر نکل گئے۔ کنیز اماں سے گلے مل کر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

کچھ لمبے راستے پر جب وہ تھوڑی دور چل لی تو اس نے مڑ کر دیکھا کہ اماں کھلے دروازے کے بیچ میں بیٹھی آنسو پونچھ رہی ہے۔ اماں سے رخصت ہوتے وقت اسے رونا نہ آیا تھا مگر اس کا جی بھر آیا۔ وہ رک کر اماں کو دیکھنے اور آنسو پونچھنے لگی۔ "اماں! میں تیرا بڑا کھیال رکھوں گی تو پھکر نہ کرنا۔" کنیز کا جی

چاہا کہ چلا کر کہہ دے۔ جانے کیوں اب اس کے قدم نہ اٹھ رہے تھے۔

دین محمد چلتے چلتے رک گیا۔ "کیوں روتی ہے ری، جلدی جلدی چل نہیں تو دھوپ تیج ہو جائے گی۔"

"اپنا آدمی اپنا ہوتا ہے ری، ابھی سے کھیال کر رہا ہے۔" کنیز کے پاؤں جلدی جلدی اٹھنے لگے۔ اگلی پگڈنڈی پر جب وہ مڑی تو اس کا گھر اور گاؤں نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔

چلتے چلتے وہ پسینے میں نہا گئی۔ ہونٹوں پر لگا ہوا لال رنگ پسینے میں بہہ گیا اور مارے گرمی کے اس کا سانولا رنگ تپ کر سیاہ لگنے لگا۔ راستے کی دھول نے اس کے پھول دار پاجامے کو گھٹنوں تک ڈھانپ دیا تھا، پھر بھی اسے تھکن کا احساس نہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آدمی کے ساتھ اپنے گھر جا رہی تھی۔ اس کے خوابوں میں بسنے والا، چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا جوان، موٹی سی لاٹھی زمین پر مارتا اس کے آگے آگے چل رہا تھا اور کنیز کی آنکھیں اس کی پیٹھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے سوا وہ کچھ نہ دیکھ رہی تھی۔ کھیتوں میں ہل چل رہے تھے۔ بکریوں کے ریوڑ ادھر سے ادھر چرتے پھر رہے تھے اور چرواہے لڑکے لاٹھی کے سہارے ٹک کر اسے بڑے غور اور دل چسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"بس وہ اپنا گاؤں دکھتا ہے ری۔" چلتے چلتے دین محمد نے رک کر کہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ کنیز بھی تیزی سے چلنے لگی۔ "ہے رے دھیرج بندھاتا ہے، جانتا ہوگا کہ میں تھک گئی، ارے میں تیرے ساتھ چل کر نہیں تھکتی رے۔" کنیز نے بڑے جوش سے سوچا۔

اگلی پگڈنڈی کے موڑ پر وہ چاروں آدمی ہاتھ ملا کر دین محمد سے رخصت ہو گئے۔ "وہ اپنا گھر دکھتا ہے ری——" دین محمد نے سب کو رخصت کر کے کنیز کی طرف دیکھا اور پھر اس کے برابر چلنے لگا۔ "تو گھر سنبھال لے گی؟ میرے دو بچے ہیں، سکینہ بہت بیمار رہتی ہے۔"

"تو پھکر نہ کر مجھے سب مالوم ہے۔" کنیز نے آہستہ سے جواب دیا۔

"لڑائی جھگڑا تو نہ کرے گی؟"

میں تجھے سرمندہ نہ کروں گی، پھکر نہ کر۔" کنیز نے کہا۔ اس کا جی بیٹھا جا رہا تھا۔ گھر قریب تھا اور وہ تھک گئی تھی۔ اس سے اب ایک قدم بھی نہ اٹھ رہا تھا۔ "ارے دین محمد اس وکھت تو کوئی اچھی سی بات کر لیتا' اپنا مالمہ پکا کرتا ہے۔ لڑنا ہوتا تو ساتھ آنے کو راجی کیوں ہوتی —— تو کنیج کو نہیں جانتا۔ "اپنی تو کسمت ہی کھراب تھی ری' لڑ کر کسے کھوسی ملے ہے۔"

"دوپہر پلٹ چکی تھی... اب دونوں گاؤں کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ عورتیں کنویں پر پانی بھر رہی تھیں اور گاؤں کی پن چکی بڑے زور سے ہک ہک کر رہی تھی۔ دین محمد ایک گھر کے سامنے رک گیا اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کنیز بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر چلی گئی۔ دین محمد جھپٹ کر آگے بڑھا اور برآمدہ میں لیٹی ہوئی سکینہ پر جھک گیا۔" "کیسی طبیعت ہے ری؟"

کنیز اجنبیوں کی طرح آنگن میں کھڑی رہ گئی۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے گوندھی ہوئی مٹی سے کھیلتے کھیلتے اٹھ کر اسے اشتیاق اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"لے آیا رے؟" سکینہ بستر سے اٹھنے کی کوشش میں جیسے گر سی پڑی۔

"لے آیا' پر تو نہ اٹھ طبیعت کھراب ہو جائے گی۔"

سکینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے تکیے کے نیچے رکھا ہوا دوپٹہ نکال کر اپنے منہ پر ڈال لیا جیسے وہ کچھ بھی نہ دیکھنا چاہتی ہو۔

"اری تو ہی نے تو کہا تھا کہ گھر اور بچے تباہ ہو رہے ہیں۔" دین محمد بڑا بیتاب ہو رہا تھا اور بار بار اس کے چہرے سے دوپٹہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو ہاتھ منہ دھو لے رے' میری طبیعت بگڑ رہی ہے' ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔" سکینہ نے منہ پر سے پلو ہٹا لیا اور دین محمد کا ہاتھ پکڑ کر بڑے انداز سے دیکھنے لگی۔

کنیز آنگن میں کھڑی جیسے نہ کچھ دیکھ رہی تھی نہ سن رہی تھی۔ دیوار پر بیٹھے ہوئے کوے شور مچا رہے تھے اور آنگن کے ایک کونے میں بندھی ہوئی بھینس جانے کیوں ڈکرا رہی تھی۔

اندر آ جا ری کنیز' وہاں کیوں کھڑی ہے۔" سکینہ نے نقاہت سے کہا اور کنیز دھیرے دھیرے چلتی ہوئی سکینہ کے پاس جا بیٹھی۔ چاول اور گڑ کی پوٹلی اس کی گود میں آ پڑی۔

"گھونگھٹ الٹ دے ری۔" سکینہ نے اشتیاق سے کہا ——"میں بھی تو منہ دیکھوں تیرا۔" کنیز نے نیچی نظروں سے سکینہ کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئی۔ "ہے ری کیسی کھوبصورت بلا ہے پر جان میں تو کچھ رہا نہیں' ہڈیاں ہی ہڈیاں' جانو کبر کے کنارے لگ گئی ہے اور کتنے دن جیے گی گریب۔" کنیز نے بھی اطمینان کی سانس لی۔

سکینہ کی بری حالت نے اسے جانے کتنا مطمئن کر دیا تھا پھر بھی سکینہ کا حسن آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔

دین محمد ہاتھ منہ دھو کر لال انگوچھے سے منہ پونچھتا ہوا باہر چلا گیا تو سکینہ پٹی کی ٹیک لے کر اٹھ گئی۔ "بڑے دنوں سے بیمار ہوں' کوئی نہ گھر دیکھنے والا ہے نہ بچے۔"

"تو پھکر نہ کر ری' میں جو آ گئی ہوں تیری کھدمت کرنے۔" کنیز نے دھیرے سے کہا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی ——"مجھے سب کام بتا دے۔" وہ دوپٹے کے پلو میں بندھے ہوئے چاول کھولنے لگی۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ سکینہ کی آنکھوں میں اس کے لئے کتنی نفرت تھی۔

چاول اور گڑ کی بھیلی تھالی میں رکھ کر کنیز نے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گھڑے کے پاس بیٹھ کر ان کا منہ ہاتھ دھلانے لگی۔ "راجہ بابو منہ دھلائے گا' گڑ کا ملیدہ کھائے گا۔" وہ لڑکوں کو ضد کرنے پر بہلا بھی رہی تھی۔

دوپٹے کے پلو سے منہ ہاتھ پونچھنے کے بعد وہ بچوں کو کوٹھری میں لے گئی اور پھر چھوٹے سے ہرے پھولدار بکس سے کپڑے نکال کر بچوں کو پہنا دیئے۔ ہاتھ منہ صاف کرا کے دونوں کیسے پیارے لگ رہے تھے۔ بڑے لڑکے کی رنگت تو بالکل سکینہ جیسی تھی۔ چھوٹا باپ پر پڑا تھا۔ کنیز کو چھوٹے پر بڑی ممتا پھٹ رہی تھی۔ اس نے چھوٹے کو لپٹا کر چومنا شروع کر دیا۔ "ہے ری کچھ دن بعد بے چارے بن

ماں کے رہ جائیں گے، پر میں انہیں تکلیف نہ ہونے دوں گی۔ یہ تو میرے دین محمد کے بچے ہیں۔"

بچے خوشی خوشی باہر نکل گئے تو کنیز اپنے گھر کا جائزہ لینے لگی۔ تین بڑے بڑے بکس جن میں تالے پڑے ہوئے تھے۔ پیتل کے بھاری بھاری، سرخ پایوں والا نواڑی پلنگ اور اس کے پائنتی رکھا ہوا نیا لحاف اور گدا، ایک طاق اور رحل پر قرآن شریف رکھا تھا، دوسرے طاق میں گیس کی لالٹین اور تیسرے طاق میں آئینہ اور سرمے دانی۔

کنیز کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح ان تینوں بکسوں کو بھی کھول کر دیکھ لے۔ جانے کیا کچھ بھرا ہوگا، آخر تو اب یہ سب چیزیں اس کی ہیں۔ سکینہ کی بری حالت دیکھ کر کنیز کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس گھر سے مر کر ہی نکلے گی۔

ہر چیز پر دھول جمی تھی، بچوں نے ہر طرف کوڑا پھیلا رکھا تھا۔ جانے کب سے کوٹھری میں جھاڑو نہ دی تھی۔ کنیز کو افسوس ہونے لگا۔ "عورت روج روج کی بیمار ہو تو پھر یہی ہوتا ہے ری۔ اسی کارن تو بے چارے کو دوسری سادی کرنی پڑی۔ ایسی عورت سے بھلا کیا سواد ملے۔" کنیز نے شرما کر دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ لیا۔ "ہے ری کیسا محلوں جیسا گھر ملا ہے کیسی کیسی چیجیں کہ آدمی کی نجر نہ ہٹے۔"

دالان میں آکر اس نے سکینہ کی طرف دیکھا جو نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی سکینہ نے چونک کر کنیز کی طرف دیکھا۔ "باہر چھپریا تلے جو بیل بندھے ہیں وہ اپنے ہیں ری؟" کنیز نے پوچھا۔ اس وقت وہ سب کچھ بھول کر گھر کی مالکن بنی ہوئی تھی۔

"کیوں ری! کس لئے پوچھ رہی ہے؟" سکینہ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ پھر تجھے کیا، بیل میرے ہیں تیرے باپ کے نہیں۔ "اب جا کر ہانڈی چڑھا دے، سام ہو رہی ہے، دینو جلدی روٹی کھاتا ہے بھینس بھی دوہ لے۔" سکینہ نے منہ پھیر لیا۔

"ہے ری کیسا کجور ہے، کل کی آس نہیں، جندگی نام کو باکی نہیں۔" کنیز صحن میں جا کر بالٹی دھونے لگی۔ "اری اب تو یہ گھر میرا ہے، تیری بھی کھدمت کر

دوں گی۔"

بھینس دوہتے ہوئے کنیز کو عجیب سا فخر محسوس ہو رہا تھا——"ہے اتنا بڑا جانور، جانو ہاتھی لگتا ہے۔ بھلا بکری بھی کوئی چیج ہوئی۔ ایک لٹیا دودھ دے اور سینگ مارے الگ۔" بھینس کے ساتھ اسے اپنی بکری بھی یاد آ گئی اور اماں کی تنہائی کا خیال بھی ستانے لگا۔ "جانے بے چاری اماں کیا کرتی ہوگی، پر بیٹیاں ہمیشہ تو نہیں بیٹھی رہتیں۔"

شام ہو گئی تھی، آنگن کی کچی دیوار پر بیٹھے ہوئے کوے کائیں کائیں کرتے اڑ گئے۔ باہر سڑک سے بھینسوں اور بکریوں کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے دال صاف کر کے چڑھا دی اور پھر دو گھڑے اٹھا کر کنویں پر پانی بھرنے چلی گئی۔ بچوں کا ہاتھ منہ دھلانے کے بعد ذرا سا پانی رہ گیا تھا۔

گھڑے منڈیر پر رکھ کر وہ اپنی باری کا انتظار کرنے لگی، دوسری عورتیں بڑی تیزی میں تھیں۔ "اری تو دوسرے گاؤں سے آئی ہے، دین محمد کی عورت ہے نا؟" ایک عورت نے اس سے پوچھا۔

"ہاں ری!" کنیز نے غرور سے گردن اونچی کر کے ذرا سی گھونگھٹ نکال لی۔

"آج ہی تو لایا ہے کر کے، اس دنیا کا کیا اعتبار، سکینہ کو تو مر لینے دیتا۔" دوسری عورت نے کہا اور گھڑا کمر پر جما کر چل دی۔

"چڑیل کو جانے کاہے کا دکھ ہے۔" کنیز نے ٹیڑھی ٹیڑھی نظروں سے جاتی ہوئی عورت کو دیکھا اور گراری میں رسی ڈال دی۔

پانی بھر کر جب گھر لوٹی تو دین محمد چھوٹے کو گود میں لئے سکینہ کے پاس بیٹھا تھا اور سکینہ منہ موڑے لیٹی تھی۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بار بار شانے پر ہاتھ رکھ رہا تھا اور آنچل کھینچ رہا تھا۔ کنیز کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل کے بالکل قریب کسی نے آگ جلا دی ہے۔ وہ جلدی جلدی روٹیاں پکانے لگی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھاتی بھی جا رہی تھی۔ "اری تجھے تو پہلے ہی مالوم تھا، پھر کیا

پھائدہ اس کڑھنے کا، تجھے تو چھ مہینے کو لے کر آئے ہیں۔ تو تو مسا پھر ہے ری۔ رات کے رات ٹھہرے، منہ اندھیرے چل دیئے۔" کنیز نے ٹھنڈی آہ بھری اور دونوں لڑکوں کو پیار کر کے روٹی کھلانے لگی۔

بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد اس نے ڈلیا میں روٹی اور دال کا پیالہ رکھ کر سکینہ کی طرف بڑھا دیا جو اب تک منہ پھیرے لیٹی تھی۔ پھر چپ چاپ کھڑے ہو کر نیچی نیچی نظروں سے دین محمد کو دیکھنے لگی۔

"اٹھ کر تھوڑا سا کھا لے۔" دین محمد نے سکینہ کو سہارا دیا تو وہ بڑے تکلف سے اٹھ گئی اور دین محمد اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر کھلانے لگا۔ سکینہ ہر نوالے پر بس بس کر رہی تھی اور کنیز بڑی بے بسی سے کھڑی دیکھ رہی تھی کہ اس جھانکڑ جیسی عورت میں اب کیا رہ گیا ہے جو دین محمد اس کے پیچھے پاگل ہو رہا ہے۔

"بس کر دینو میرے پیٹ میں چھریاں چلتی ہیں رے۔" دو چار نوالوں کے بعد سکینہ نے تڑپ کر پیٹ پکڑ لیا۔ دین محمد نے گھبرا کر اسے لٹا دیا اور طاق سے چورن کی شیشی اٹھا کر پھنکارنے لگا۔

کنیز روٹی کی ڈلیا اٹھا کر چولہے کے پاس چلی گئی۔ کیسا جی دکھ رہا تھا۔ دینو نے کچھ بھی تو نہ کھایا ری، اسی لئے تو کمجور ہو رہا ہے، نہ کھد کھائے نہ کھانے دے، میں ہوتی تو اس کے لئے جبردستی کھاتی، چاہے میرا پیٹ پھٹ جاتا، کیسی جھوٹی محبت کرتی ہے تو بھی، جانے کس سے جادو کرا دیا ہے، ویسے کون پھرتا ہے بیمار عورت کے پیچھے۔"

کنیز کو کئی نام یاد آ گئے جن کی عورتیں ہمیشہ بیمار رہتیں اور وہ انہیں پلٹ کر پوچھتے تک نہ تھے۔ ان میں سے دو ایک تو کنیز کے پیچھے پھرتے تھے۔

سامان بٹورتے اور بھینس کو سانی لگاتے خاصی رات ہو گئی۔ دور سے سیاروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور جانے کہاں، کتنی دور بہت سی مردانی آوازیں مجیرے پر گا رہی تھیں۔ پیا سوتن گھر جائے بسے ہو ہو۔

کنیز کان لگا کر سننے لگی ــــــ "لے تیری سادی کی کھوسی میں گانے ہو رہے ہیں، تیری تو ایسی سادی ہوئی کہ نہ ڈھول بجی، نہ ڈولی میں بیٹھی، کسی نے بیل گاڑی

بھی نہ کی، بس تیری سادی ہوگئی۔" پھر ایک دم کنیز کو یاد آیا کہ آج تو اس کی شادی کی پہلی رات ہے۔ ابھی تو اسے اپنا بستر لگانا ہے۔ "بھلا تو کہاں سوئے گی ری ——— تو اس سے کون کون سی باتیں کرے گی؟ ہائے کیسا میٹھا میٹھا لگتا ہے۔"

"تو چھوٹے کو اپنے پاس سلا لیجیو ری۔ آنگن میں بستر لگا لے۔ اچھی طرح اڑھا لیجیو، رات اوس پڑتی ہے، چھوٹے کو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔" سکینہ نے درد سے تڑپتے ہوئے اور دین محمد کی آغوش میں سر ٹیکتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ بری طرح کراہ رہی تھی۔

کنیز کو ایسا لگا کہ سکینہ کے پیٹ سے ایک چھری نکل کر اس کے کلیجے کو چیر گئی ہے۔ وہ ذرا دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ رات کے سناٹے میں کنویں کی گراری گھومنے کی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی ——— اماں نہ کہتی تھی کہ سوچ لے۔ "اب کاہے کا گم کرتی ہے؟" کنیز نے اپنے آپ سے پوچھا۔

آنگن کے ایک کونے میں بستر لگا کر اس نے باہر کے دروازے بند کر لئے اور پھر چھوٹے کو اپنے سینے سے لگا کر لیٹ گئی۔

"بھول تو نہ جائے گا رے؟ سکینہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔ دینو نے کیا کہا، کنیز سن نہ سکی۔ اس نے گردن اچکا کر برآمدے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں منہ سے منہ جوڑے لیٹے تھے۔

کنیز نے ٹھنڈی آہ بھری ——— "جانے چاند کی کون سی تاریکھ ہوگی۔ ساید رات گجرے چاند نکلے گا، ابھی تو اندھیارا پھیلا ہے۔" کنیز جیسے اپنے جی کو بہلا رہی تھی۔ "جانے گاؤں والوں نے اپنے جی میں کیا سوچا ہوگا، کہتے ہوں گے کہ لو کنیج کی بھی سادی ہوگئی، اب جرور پچھتاتے ہوں گے کہ ہم نے کیوں نہ سادی کرلی۔ سب جرور یاد کرتے ہوں گے، پر اب یاد کرنے سے کیا بنتا ہے ری۔ اس وکھت تو سب کو کہہ تھکی کہ گھر میں بٹھا لو، تب کسی نے نہ مانا۔"

ایک بار اس نے پھر گردن اچکائی۔ وہ دونوں اسی طرح لیٹے تھے ——— "ساید سو گئے۔ گریب سوئے نہ تو کیا کرے، مرد جاگے تو کچھ اور ہی یاد آتا ہے۔ اس نے جادو کرا کے کابو میں کرلیا ہے۔ کب تک جئے گی۔"

تین کوس پیدل چلنے کی تھکن نے اسے جلد ہی سلا دیا مگر وہ صبح منہ اندھیرے اٹھ گئی۔ بھینس دوہنے کے بعد اس نے آگ جلا کر دودھ پکنے کے لئے رکھ دیا اور پھر جلدی سے رات کے جمے ہوئے دہی کو متھنے بیٹھ گئی اتنے میں دین محمد جنگل سے فارغ ہو کر آگیا۔ اس نے رات کی باسی روٹی سے ناشتہ کیا اور چھاچھ کا گلاس پی کر جانے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ "سکینہ کا خیال رکھیوری۔" باہر نکل کر چھپریا تلے بیل کھول کر وہ جلدی سے انہیں ہانکنے لگا۔

کنیز اسے ناشتہ کرتے اور جاتے ہوئے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی تھی۔ اسے کتنا انتظار تھا کہ شاید وہ کچھ کہے گا۔ سکینہ سو رہی تھی اب تو وہ کچھ کہہ سکتا تھا۔

دین محمد کے جانے کے بعد کنیز نے بھینس کے نیچے سے گوبر سمیٹ کر اس میں پیلی مٹی ملائی اور سکینہ اور بچوں کے سو کر اٹھنے سے پہلے پہلے کوٹھری اور برآمدہ لیپ ڈالا۔ جس وقت سے وہ یہاں آئی تھی جگہ جگہ سے کھدی ہوئی زمین کھل رہی تھی۔

کوٹھری کو لیپتے ہوئے اس نے بڑا سکون محسوس کیا تھا —— اسے بڑے سہانے خواب نظر آرہے تھے اور وہ اپنے کو سمجھا رہی تھی۔ "اری کچھ دن کی دیر ہے، ماہ پوہ کی سردی میں تو یہیں اس نواڑی پلنگ پر دینو کی چھاتی سے لگ کر سویا کرے گی۔ سکینہ نہیں جینے کی۔"

ہاتھ دھو کر جب وہ بچوں کو لپٹائے پیار کر رہی تھی تو سکینہ اٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ذرا دیر کے لئے التفات کی جھلک آکر غائب ہوگئی۔ اس نے کراہتے ہوئے کنیز کو آواز دی تو وہ اس کے لئے دودھ کا گلاس لے کر بھاگی۔ "ہائے ری سکینہ، رات کی تکلیف میں کیسا پیلا منہ ہو رہا ہے، ذرا سا دودھ پی لے تو کچوری جائے۔"

سکینہ نے بڑی مشکل سے دو گھونٹ لئے اور پیٹ سہلانے لگی۔ "نصیبوں سے کھانا پانی اٹھ گیا ہے ری، تو جلدی جلدی روٹی پکا لے، کھیت پر لے جانی ہوگی، چھوٹے کو ساتھ لے جائیو، رستہ بتا دے گا۔" سکینہ نے کراہتے ہوئے کہا اور پھر لیٹ گئی —— کتنے خطرات، کتنی نفرت اس کی آنکھوں میں امنڈ رہی تھی، کتنی

ناکامیاں زہر گھول رہی تھیں۔

موٹی موٹی گھی چپڑی دو روٹیاں اور چھاچھ سے بھری ہوئی لٹیا لے کر جب کنیز نے کھیت پر جانے کے لئے چھوٹے کی انگلی پکڑی تو سکینہ جیسے ناگن کی طرح لوٹنے لگی۔ ”روٹی دے کر پھورا“ مڑ آئیو‘ دھوپ اس دیوار تک نہ چڑھنے پائے ری۔“ سکینہ نے سامنے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ کنیز نے مڑ کر دیکھا‘ دھوپ دیوار کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔

کنیز جب کھیت پر پہنچی تو دین محمد تھک کر ایک پیڑ تلے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر دھول کا غبار سا چھایا ہوا تھا۔ کنیز اس کے قریب بیٹھ گئی اور انگوچھا کھول کر روٹی سامنے رکھ دی۔ دین محمد نے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر کھانے لگا۔ ”سکینہ کیسی ہے ری؟“ اس نے پوچھا۔

”اچھی ہے رے۔“ کنیز نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”اتنی دور سے آئی ہوں‘ مجھے بھی پوچھ لے رے!“ کنیز نے ٹھنڈی سانس بھری۔

دین محمد نے کوئی جواب نہ دیا اور روٹی کھا کر برتن انگوچھے میں باندھ دیئے ”تجھے میرا گھر اچھا لگا ری؟“ دین محمد نے دھیرے سے پوچھا جیسے کسی کے سننے کا خوف طاری ہو۔

”تیرا گھر نہیں‘ میرا گھر ہے دین محمد۔“ کنیز نے کچھ اس طرح سر اٹھا کر کہا کہ دین محمد ایک لمحے کو جیسے ان آنکھوں میں کھو کر رہ گیا۔ ”اچھا رے میں چلی۔ سکینہ نے کہا تھا کہ دھوپ دیوار پر نہ چڑھے تو لوٹ آئیو۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تو اس کی کھوب کھدمت کرے گی نا؟“ سکینہ کا نام سنتے ہی دین محمد کا چہرہ اتر گیا۔

”میرے اوپر بھروسہ کر رے۔“ وہ چھوٹے کی انگلی پکڑ کر چل دی۔

گھر پہنچی تو سکینہ کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ”تو نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟“ سکینہ جیسے چیخ پڑی۔

”لمبا رستہ ہے سکینہ! اس نے روٹی کھائی تو میں اٹھ پڑی۔

”تو نے اس سے کون سی باتیں کی تھیں؟“ سکینہ نے اسے گھورا۔

"اری! مجھے کیا کہنا ہے، میں تو تیری کھدمت کو آئی ہوں۔" کنیز کمر پر گھڑا جما کر پانی بھرنے چلی گئی۔

شام جب دین محمد کھیت پر سے واپس آیا تو سکینہ بیتابی سے اٹھ پڑی اور اس کی آنکھوں میں اس طرح جھانکنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ دین محمد نے اس کا سر سینے سے لگا لیا تو سکینہ سرگوشیوں میں اس سے جانے کیا کہتی رہی۔ یہاں تک کہ ذرا ہی دیر میں دینو صافے سے آنسو پونچھنے لگا۔

"ارے تو کیوں روئے، تیرے دسمن روئیں" —— کنیز نے پھڑک کر ادھر دیکھا مگر کچھ نہ کہا۔ توے پر پڑی ہوئی روٹی جلتی رہی۔ اس کا کیسا جی چاہ رہا تھا کہ دین محمد کے آنسو پونچھ ڈالے اور سکینہ کا گلا گھونٹ کر یہ چار دن کی زندگی بھی چھین لے۔

رات مارے درد کے سکینہ نے کچھ نہ کھایا۔ دین محمد نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ کنیز بچوں کو کھلا کر خود بھی بھوکی پڑ رہی، پھر اس سے کون کہتا کہ تو بھوکی نہ رہ۔ ہاں سکینہ ساری رات ٹھنڈی آہیں بھرتی رہی اور دین محمد اس کی ہر آہ پر سوتے میں بھی چونکتا رہا۔

دوسرے دن جب کنیز کھانا لے کر اس کے پاس کھیت پر گئی تو اس نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، بیلوں کی طرح سر جھکا کر کھانا شروع کر دیا۔

"بہت تھک گیا ہے رے، تو کھانا کھا لے تو میں تیرے پاؤں داب دوں۔" کنیز نے اس کے قریب سرک کر کہا۔ چھوٹا ادھ گڑے کھیت میں ادھر سے ادھر بھاگا پھر رہا تھا۔ "تجھ سے سکینہ نے کہا ہے کہ بات نہ کیجیو۔ نہ بول، پر میں تو بولوں گی، اس نے مجھے کونسی کسم دی ہے، تجھ سے نہ بولوں گی تو پھر کس کے سنگ بات کروں گی رے، کیوں میں جھوٹ کہتی ہوں؟"

دین محمد پھر بھی کچھ نہ بولا۔ بس ایک بار نظر اٹھا کر کنیز کی طرف دیکھا اور پھر چھوٹے کو آواز دینے لگا۔

کنیز ذرا اور قریب سرک گئی۔ دین محمد چھوٹے کو گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگا۔

"یہ کس کے نام کی ہمیاں لے رہا ہے رے؟" کنیز نے اسے چھیڑا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ دین محمد نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ "گھر جا ری"۔۔۔۔۔ اس نے چھوٹے کو گود سے اتار دیا اور بیلوں کی طرف بڑھ گیا۔

"ہائے تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ مجھ سے کیوں بھاگتا ہے؟ کیا میری تیری سادی نہیں ہوئی؟ تین کوس دور تیرے پیچھے آئی ہوں رے۔۔۔۔۔" کنیز اکیلی بیٹھی سوچتی رہ گئی اور پھر برتن اٹھا کر چھوٹے کی انگلی پکڑلی۔ دینو کی شرافت پر تو وہ اس وقت قربان ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو جانے کیا کرتا ری پر وہ آدمی تھوڑے ہوتے ہیں، ڈنگر ہوتے ہیں۔"

گاؤں والے حیران تھے کہ کنیز نے گھر اور بچوں کو سنبھال لیا۔ سکینہ کی خوب خدمت کی، کبھی کسی نے لڑنے بھڑنے کی آواز نہ سنی۔ جب کنویں پر جاتی عورتیں سکینہ کا حال پوچھتیں اور وہ ایسی رقت سے اس کی خراب حالت کا ذکر کرتی کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ جوں جوں سردی بڑھتی جا رہی تھی سکینہ کی حالت بھی گرتی جا رہی تھی۔ کنیز اطمینان کی لمبی لمبی سانسیں لیتی مگر اس کی یہ کیفیت کون جانتا تھا۔ دین محمد خوش نظر آتا تھا کہ اس کی سکینہ کی خوب خدمت ہو رہی ہے مگر جب کنیز کھیت پر روٹی لے کر جاتی اور اسے رجھانے کے لئے باتیں کرتی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔

جب سے سردیاں پڑی تھیں۔ سب لوگ ایک ہی کوٹھری میں سوتے، ایک سرے پر سکینہ اور دین محمد کا پلنگ ہوتا، دوسرے سرے پر کنیز چھوٹے کو لے کر لیٹتی۔ سرشام پکا کھا کر وہ کوٹھری کو اپلے جلا جلا کر گرم کر دیتی اور پھر دور پڑے پڑے دیکھتی رہتی کہ کراہتی ہوئی سکینہ پر دین محمد جھکا ہوا ہے، اسے سہلا رہا ہے، دبا رہا ہے، چوم رہا ہے، اس کی تکلیف پر آنسو بہا رہا ہے۔ کنیز تڑپتی رہتی، جلتی رہتی، اس کے شوہر کو ایک بیمار عورت چھینے ہوئے تھی مگر کنیز منہ سے اف بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ سکینہ کی موت کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کو بہت سے لوگوں نے بتایا تھا کہ بعض جادو ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر اسی وقت ختم ہوتا ہے جب کہ جادو کرانے والا مرجائے۔

شام پڑتے ہی کنیز جلدی جلدی سارا کام ختم کر لیتی تو بھینس کو دالان میں باندھ کر اپنے بستر میں آ جاتی۔ دین محمد جیسے ہی گھر میں آتا اور سکینہ کے پاس بیٹھتا تو کنیز کے ہاتھوں میں جیسے بجلی کی تڑپ آ جاتی ـــــ "ہائے ری جانے وہ دونوں کیا کر رہے ہوں گے، کون سی باتیں کرتی ہوگی سکینہ؟" گھنٹوں کے کام منٹوں میں کر کے وہ اپنی کھاٹ پر آ جاتی اور سکینہ کو بار بار کام یاد آنے لگتے۔ مگر آج جب وہ اپنی کھاٹ پر لیٹی تو سکینہ کو کوئی کام نہ یاد آیا۔ دین محمد کے کندھے پر سر رکھے جانے کیوں وہ چپ چاپ بیٹھی دیے کو تکے جا رہی تھی۔ دین محمد بار بار اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے۔ کنیز کا جی چاہ رہا تھا کہ چیخ کر کہہ دے "مرنے والے اسی طرح روسنی کو تکتے ہیں رے، تو کیوں بھکر کرتا ہے۔"

"تیل کھتم ہو جائے تو بتی آپی آپ بجھ جاتی ہے رے، میری جندگی کا تیل بھی کھتم ہو رہا ہے۔" دین محمد کے اصرار پر آخر سکینہ بول ہی پڑی۔

"اس طرح کہے گی تو میں کنویں میں کود پڑوں گا، تو نے تو ساری باتیں بھلا دیں سکینہ۔" دین محمد بیتاب ہو رہا تھا۔

کنیز تن من سے سن رہی تھی ـــــ "کون سی باتیں رے دین محمد، تجھ سے کیا کہا تھا سکینہ نے ہائے رے مجھے نہ بتائے گا؟ کیا تو میرا آدمی نہیں؟ مجھے بتا، میں جو تیری عورت ہوں۔ ارے دین محمد میں نے تیرے ہی تو کھواب دیکھے تھے۔" کنیز بار بار کروٹیں بدل رہی تھی اور سکینہ دیے کی لو تکے جا رہی تھی۔

"بول ری؟" دین محمد اس سے جواب مانگ رہا تھا۔

"پھر باعدہ کر کہ اگلے مہینے پھسل کاٹ کر مجھے سہر آگرہ علاج کے لئے لے جائے گا، وہاں بڑے اسپتال میں رکھے گا، تو چاہے گا تو تیل کبھی نہ کھتم ہوگا۔"

"سہر میں علاج کے لئے تو بہت سے رپیوں کی جرورت ہوگی، پر تو نے پہلے کیوں نہ کہا۔ میں تیری کھاطر بل، بیل، بھینس سب بیچ دوں گا۔ پھسل کا دانہ دانہ اٹھا دوں گا، میں بھوکا رہ لوں گا پر تجھے جرور لے جاؤں گا۔"

"بھوکے مریں تیرے دشمن۔" کنیز تڑپ کر بیٹھ گئی۔ "کون بیچے گا میرے بیل، میری بھینس، پھر یہ سب کہاں سے ملے گا رے ـــــ؟ گاؤں والے بے عجت

سمجھیں گے، سہر میں تو بابو لوگ جاتے ہیں علاج کرنے ـــــ" جانے کیسے کنیز نے یہ سب کچھ کہہ دیا۔ اس کا تن لٹ رہا تھا اب گھر لٹتے کیسے دیکھتی۔

"اری تو کون بولنے والی۔ کہاں سے آگیا تیر گھر حرام جادی! تجھے تو چھ مہینے کے لئے کھدمت کرنے کو لائی ہوں۔" سکینہ ڈائنوں کی طرح چیخی۔ "کھبردار جو اب تونے بات کی، جان کھینچ لوں گا۔" دین محمد چنگھاڑا۔

"لے میں کیوں نہ بولوں سب بیچ دے گا تو بھوکا مرے گا، میں تجھے بھوکا کیسے دیکھوں گی، یہ تجھے الٹی باتیں سکھاتی ہے، اس نے تجھ پر جادو کیا ہے رے۔ یہ مرجائے گی پر تجھے بھوکا چھوڑ کر جائے گی۔"

"یہ مرجائے گی؟" دین محمد دیوانوں کی طرح کنیز کی طرف جھپٹا اور چوٹی پکڑ کر بے دردی سے پیٹنے لگا ـــــ "نکل جا، ابھی نکل جا ـــــ" وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔ کنیز نے ایک لمحے کو اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ اس نے اپنے جسم پر پڑتے ہوئے گھونسوں سے بچنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ چھوٹا سوتے سے اٹھ کر کنیز کے ساتھ لپٹ گیا تھا اور بری طرح رو رہا تھا۔

"بس کر رے دینو، چھوٹے کو کیوں رلاتا ہے، ابھی تو میں جندہ ہوں۔ میں اس کے کہنے سے نہ مروں گی۔" سکینہ کی آواز میں بلا کا سکون تھا۔

دین محمد نے کنیز کو چھوڑ دیا اور اپنے بستر پر آکر لحاف میں منہ چھپا لیا۔

"بس رے جلمی تھک گیا؟" کنیز نے زخمی نظروں سے دین محمد کی طرف دیکھا اور پھر چھوٹے کو سینے سے لگا کر لیٹ گئی۔

دوسرے دن جب کنیز دین محمد کا کھانا لے کر گئی تو دین محمد نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں، بس سر جھکائے روٹی کھاتا رہا اور کنیز اس کے قریب بیٹھی تکتی رہی مگر جب دین محمد نے برتن اس کی طرف بڑھائے تو ایک لمحے کو نظریں مل گئیں۔ اس کے ہونٹ کانپے اور وہ جلدی سے پیٹھ موڑ کر آگے بڑھ گیا۔

"جالم مارتا ہے تو پھر چھاتی سے بھی لگالے۔" کنیز سوچتی ہوئی تھکے تھکے قدموں سے گھر کی راہ ہولی۔ "سرمندہ ہے نجریں نہیں ملاتا۔ ارے باؤلے میں کوئی

پرائی عورت ہوں' تیری ہی تو ہوں- تیرا کیا کھور' تجھ پر تو سکینہ نے جادو کیا ہے-"

کنیز کو مارنے کے بعد جانے کیوں دین محمد پھر اس سے بات نہ کر سکا- وہ روز روٹی لے کر جاتی' جانے کتنی بہت سی باتیں کرتی ——"دینو رے' گیہوں کی کیسی موٹی موٹی بالیاں پڑی ہیں- دینو رے! چھوٹے کے کپڑے بنوا دے- چھوٹے کی صورت بالکل تیرے جیسی ہے رے! دینو رے' مجھ سے ناراج ہے کیا؟ مجھے چھوڑیو نہیں' دیکھ رے میں نے تیرے گھر کو چندن بنا دیا ہے- دینو رے! ایک بار تو مجھے بھی چھاتی سے لگا لے —— دینو رے ——"

دین محمد جانے سب کچھ سنتا بھی تھا کہ نہیں- کھانے کے بعد برتن اس کی طرف بڑھا دیتا اور فوراً ہی کھیت کے اندر چل دیتا-

فصل کٹتے کٹتے سکینہ بڑی کمزور ہو گئی- دین محمد نے ساری فصل بیچ دی تھی اور کل صبح سکینہ کو شہر لے جا رہا تھا- اسٹیشن تک جانے کے لئے بیل گاڑی کا انتظام بھی کر لیا تھا- کنیز خوش تھی کہ اب سکینہ جا رہی ہے' وہیں اسپتال میں مر جائے گی' کنیز کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے گاؤں سے کئی آدمی آگرہ اسپتال گئے تھے- جب وہ لے جائے گئے تھے تو ان کی سخت بری حالت تھی- اسپتال جا کر وہ زندہ واپس نہ آئے تھے' کنیز کو یقین تھا کہ سکینہ بھی واپس نہ آئے گی اور پھر وہ اس خیال سے بھی کتنی خوش تھی کہ دین محمد نے اسے مارنے کے باوجود بیل یا بھینس نہ بیچی تھی- ساری فصل بیچ دی تو کیا ہوا- وہ خرید کر کھا لے گی- گھی بیچ کر روپے کھرے کرے گی-

صبح منہ اندھیرے جب سکینہ جا رہی تھی تو بڑے دنوں کے بعد اس نے کنیز سے بات کی ——"بچوں کو تیرے سہارے چھوڑ رہی ہوں کنیج' ان سے برائی نہ کیجیو- جندگی کا کیا بھروسہ-" اور پھر بچوں کو لپٹا کر رونے لگی-

"کنیج مر جائے گی پر انہیں تکلیپھ نہ ہونے دے گی-" کنیز نے جواب دیا اور روتے ہوئے بچوں کو لپٹا کر کوٹھری میں چلی گئی-

دین محمد سکینہ کو بیل گاڑی میں بٹھا کر سامان اٹھانے آیا تو کنیز کو یوں دیکھنے لگا

جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

"تو تو نہ کیورے کہ انہیں اچھی طرح رکھنا' یہ تو میرے اپنے ہیں' تو جا۔"

آٹھ دس دن گزر گئے' نہ دین محمد آیا نہ کوئی خبر گئی۔ کنیز پل پل انتظار میں گزارتی۔ خواب میں کتنی ہی بار اس نے سکینہ کو مرتے دیکھا تھا۔ اس نے آخری ہچکی کی آواز تک سنی تھی۔ اس نے اطمینان کی ٹھنڈی سانسیں بھری تھیں مگر جب خواب سے چونکتی تو پھر عجیب سا عالم ہو جاتا۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ بچوں کو جیسے تیسے روٹی کھلا دیتی مگر خود کھانا بھول جاتی۔ ہاں دوپہر میں جانے اسے کیا ہوتا کہ انگوچھے میں دو روٹیاں باندھ لیتی' لٹیا میں چھاچھ بھرتی اور پھر ذرا دیر بعد انگوچھا کھول کر رونے لگتی۔ "ارے دین محمد! تو اس کے پیچھے پھرتا ہے!" جانے وہ کس سے فریاد کرتی۔

ان دنوں اسے اماں بھی یاد آنے لگی تھی۔ "جانے کیسی ہوگی' سردیاں کیسے کاٹی ہوں گی۔ اس کے گھٹنوں پر سوجن چڑھی ہوگی تو کس نے سینکا ہوگا۔ ایک بار تو آکر مل جاتی ری۔ ساید ڈرتی ہوگی کہ کنبہ ساتھ ہی مڑ آئے۔"

اماں کی یاد سے وہ بہت جلدی پیچھا چھڑا لیتی۔ اسے اپنے گاؤں سے ڈر لگنے لگا تھا۔ جانے کیوں گاؤں کا خیال بھوت کا سایہ بن جاتا۔

دسویں دن صبح صبح دین محمد آگیا۔ کنیز اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ گھٹ کر آدھا رہ گیا تھا رنگ ایسا پیلا کہ لگتا برسوں کا بیمار ہے۔ اس نے آتے ہی بچوں کو لپٹا لیا۔ کنیز دور کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

"سکینہ کی حالت بڑی کھراب ہے ری۔ اس کا آپریشن ہوا ہے۔" دین محمد نے کنیز کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے ہوئے تھے۔

کنیز کچھ نہ بولی' دین محمد کے پیروں کے پاس بیٹھ کر راستے کی دھول پونچھنے لگی۔ یہ حال بنا لیا رے' سکینہ اب نہ اچھی ہوگی تو کیوں پاگل ہوا جاتا ہے۔ کنیز بڑے اطمینان سے سوچ رہی تھی۔ آپریشن کی خبر نے اسے پکی طرح یقین دلا دیا تھا کہ اب سکینہ لوٹ کر نہ آئے گی۔

"تو مجھے جلدی سے روٹی دے دے، کام سے جانا ہے ری۔" دین محمد نے اپنے پاؤں کھینچ لئے "کل سے کچھ نہیں کھایا۔"

کنیز نے جلدی سے روٹی، پیاز کی گٹھی اور تھوڑا سا مکھن اس کے سامنے لا کر رکھ دیا اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔ اتنے دن بعد دین محمد کو دیکھ کر اسے چپ لگ گئی تھی۔ اس سے ایک بات بھی نہ کی جارہی تھی۔

جلدی جلدی روٹی کھا کر دین محمد اٹھ کھڑا ہوا اور بھینس کے کھونٹے سے زنجیر کھول کر اسے باہر ہانکنے لگا۔ کنیز بھاگ کر سامنے آگئی۔ "ابھی سے کہاں چلا رے، ابھی تو پیروں کی دھول بھی نہیں جھڑی۔"

بھینس کا سودا کر آیا ہوں، اسے بیچنا ہے ری، بہت سی دوائیں کھریدنا ہیں، آرام کا بکھت نہیں۔"

"بچے بن دودھ کے کیا کریں گے رے؟ یہ تیرے آنگن کی سان ہے، میں اسے نہ بیچنے دوں گی۔" کنیز نے زنجیر پکڑلی۔

دین محمد ایک لمحے کو جیسے بے بس سا ہو کر کنیز کو تکنے لگا اور پھر اسے اتنے زور سے دھکیلا کہ وہ دیوار سے جا لگی۔

دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دین محمد نے مڑ کر کنیز کی طرف دیکھا جو ابھی تک دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ "میرا انتجار نہ کیجو۔ میں اسٹیشن چلا جاؤں گا۔"

"بھینس نہ بیچ دینو، تجھے میری قسم نہ بیچیو۔" کنیز دروازے تک دوڑی اور پھر جیسے تھک کر وہیں دہلیز پر بیٹھ گئی۔ "اری سکینہ! تو مرنے سے پہلے میرا گھر لٹا کر جائے گی تجھے کبر میں بھی چین نہ پڑے، تیرے کیڑے پڑیں۔"

دین محمد بھینس کو ہنکاتا چلا جارہا تھا اور اس کے پیچھے دھول کا بادل امنڈ رہا تھا۔ کنیز بڑی حسرت سے ادھر دیکھ رہی تھی۔ جب دین محمد نظروں سے اوجھل ہوگیا تو وہ دروازے کا سہارا لے کر اس طرح اٹھی جیسے اچانک بوڑھی ہوگئی ہو۔ اس کی ساری طاقت جواب دے گئی ہو۔ وہ دھیرے دھیرے بڑبڑا رہی تھی —— "بیچ دے رے، کنیج پھر سے بھینس کھرید لے گی، آنگن کی سان نہ جانے دے گی۔"

بھینس جانے سے آنگن کیسا سونا سونا سا لگتا۔ کنیز نے باہر چھپریا کے نیچے

بندھے ہوئے بیل کھول کر آنگن میں باندھ لئے پھر بھی بھینس والی بات نہ بنی۔

دین محمد کو گئے چھ دن ہو گئے۔ ان دنوں میں کنیز نے ایک بار آنگن اور برآمدہ لیپ لیا تھا۔ بیلوں کے لئے کھیت سے بھوسا اٹھا کر گھر لائی تھی۔ گھر کی دیواریں جھاڑی تھیں، جالے چھڑائے تھے، پھر بھی کام کر کر کے اس کا جی نہ بھرتا۔ رات ہوتے ہوتے وہ اس قدر تھک جاتی کہ کسی کروٹ چین نہ پڑتا۔ نیند نہ آنے سے ساری فکریں دھاوا بول دیتیں۔ دین محمد کی یاد بری طرح ستاتی۔ اسے بار بار خیال آتا کہ سکینہ کی موت پر اس کا کیا حال ہو گا۔ ایسے وقت میں اس کا پاس ہونا کتنا ضروری تھا۔ وہ اسے تسلی تو دے لیتی، اس کے آنسو تو پونچھ دیتی۔ اب وہ اکیلا کیا کرے گا۔

دس دن گزرے تو کنیز کا سارے کاموں سے جی اچاٹ ہو گیا۔ وہ بولائی بولائی پھرتی۔ بچے سارا دن باہر گلی ڈنڈا کھیلتے اور تنہا کنیز کو ڈھیروں خدشات ڈسنے آ جاتے —— اگر سکینہ اچھی ہو گئی تو؟ آپریشن کے بعد وہ اتنے دن تک نہیں آیا۔ وہ اتنے دن کیسے زندہ رہی۔ کیا اس کی اتنی پتھر زندگی ہے؟ کیا وہ نہیں مرے گی؟

انجام کے انتظار میں کنیز کی آنکھیں دروازے پر لگی رہتیں۔ چھوٹا اگر کسی وقت کھیلتے کھیلتے آ کر دروازہ بند کر دیتا تو کنیز دوڑ کر کھول دیتی —— "نہ میرے لال درواجے نہ بند کر تیرا ابا آئے گا۔"

گیارھویں دن دوپہر کو دین محمد آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا جیسے بچوں کو تلاش کر رہا ہو اور پھر کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ کنیز جلدی سے اسکی طرف لپکی۔ "سکینہ کیسی ہے رے؟ تجھے کیا ہو گیا؟ تو تو پہچانا بھی نہیں جاتا۔"

کنیز جواب کے لئے اس کا منہ تک رہی تھی اور وہ کھاٹ سے پاؤں لٹکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ گال پچک گئے تھے اور ہونٹوں پر سیاہ پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

"بول رے سکینہ کیسی ہے؟" کنیز بہت بیتاب ہو رہی تھی۔

"بے بیھا نکلی، سات چھوڑ گئی جالم۔" دین محمد جیسے خواب میں بولا۔

"ہائے ری سکینہ" —— کنیز نے اپنا سینہ کوٹ لیا، بال نوچ ڈالے مگر اس

کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ اتنے زور زور سے سینہ پیٹتے ہوئے اسے ذرا بھی تکلیف کا احساس نہ ہو رہا تھا۔

وہ سینہ پیٹتے ہوئے دین محمد کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی مگر نہ تو دین محمد رویا نہ اس نے کنیز کو سمجھایا۔ اس کا چہرہ کس قدر سپاٹ ہو رہا تھا۔ شاید وہ بہت رولیا تھا۔ شاید اسے صبر آگیا تھا۔

کنیز اس کے یوں خاموش بیٹھنے پر کس قدر مسرت محسوس کر رہی تھی۔ ساری باتیں جندگی کے ساتھ ہوتی ہیں' مرے کو دو چار دن سے جیادہ کون روتا ہے ری! سب بھول جاتے ہیں۔" اس نے بڑے فخر سے سوچا اور دین محمد کے پیروں کی دھول اپنے آنچل سے جھاڑنے لگی۔ "جندگی کا کوئی بھروسہ نہیں' پل کے پل کیا سے کیا ہو جاتا ہے' اب تو گم نہ کریو۔" کنیز نے اسے سمجھانے کے لئے کہا۔

"سکینہ کی کھاطر میں نے جانے کیا کیا سہا۔ ایک رات گاؤں والوں نے گھیر کر لاٹھیوں سے مارا بھی تھا۔ جکھم اب تک نجر آتے ہیں۔" دین محمد نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "اس کے کھلیرے بھائی نے کتنا جور مارا' کتنے جتن کیئے پر سکینہ میرے پاس آ کے رہی۔ اس کا عاسک جہر کھا کر مر گیا پر سکینہ اس کی موت پر بھی نہ گئی۔ کہتی تھی میں تو ایک پل کو بھی تیرا ساتھ نہ چھوڑوں۔ جا' جالم! آکھر کو سدا کے لئے ساتھ چھوڑ گئی ناں۔" دین محمد نے احمقوں کی طرح ہر طرف دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔

پھر وہ ایک دم چونک پڑا اور کنیز سے بولا۔ "لے کنیج! ایک جروری بات تو میں بھول ہی گیا۔"

اسی ضروری بات کے لئے تو کنیز نے چھ مہینے دین محمد کی پوجا میں گزار دیے تھے۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ "ہائے جلدی سے بول دے نا جروری بات۔"

دین محمد نے کرتے کی جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر کنیز کی طرف بڑھا دیا۔ تیرا کام کھتم ہو گیا کنیج! چھ مہینے پورے ہو گئے۔ یہ لے' میں نے کاگج لکھوا لیا ہے۔ اب جا۔"

"دیئو رے!——" کنیز آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے جیسے کچھ کہنا ہی نہیں تھا۔

پلٹ کرایک پل کے لئے اس نے چھوٹے کو ڈھونڈا پھر اٹھی، کاغذ کو پاجامے کے نیفے میں اڑسا اور بولی۔ "ہاں رے، اب چلوں، نہیں تو سام پڑ جائے گی۔"

# راستہ

گھٹیا چائے خانے کا ریڈیو فرمائشی پروگرام سنا رہا تھا' وہ بھی ایسے زور شور سے کہ لتا کی آواز کا جادو دور دور تک چھایا جا رہا تھا۔ جنوری کی اس انتہائی سرد رات میں اس نے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت اداس ہے' تنہا ہے اور اسے کوئی گلے سے نہیں لگاتا۔ اس نے دل ہی دل میں لتا کے گائے ہوئے بول دہرائے "مجھے گلے سے لگالو بہت اداس ہوں میں۔"

اس نے بجھی بجھی نظروں سے چائے پینے والوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنی چائے کی ایک پیالی کے دام ادا کر کے لوہے کی سیاہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سامنے کے سینما ہاؤس سے آخری شو شروع ہونے کی گھنٹی کی آواز اسے بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ سڑک کے اس پار کھڑے کھڑے اس نے ایک لمحے کو ذرا دلچسپی سے اس طرف دیکھا۔ وہ لوگ جو تیسرے درجے کے ٹکٹ نہ خرید سکے تھے' ان میں قیامت کی نفسانفسی تھی اور جنہیں ٹکٹ مل گیا تھا وہ سینما ہال کے دروازے پر جیسے ہلا بول رہے تھے۔

اس نے بڑی احتیاط سے پرانے مفلر کو کانوں پر لپیٹ لیا اور لنڈے بازار سے خریدے ہوئے اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ چھپا کر آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔

یہ راتوں کو بارہ بجے تک کی آوارہ گردی جیسے اس کا نصیب بن چکی تھی۔ ان راتوں میں چاہے کہر پڑ رہی ہو' چاہے چھاجوں بارش ہو رہی ہو یا مارے گرمی کے سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا ہو' وہ یوں ہی بے مقصد ٹہلتا اور سوچتا رہتا۔

اُن اَن گنت راتوں میں جب وہ ٹہل ٹہل کر تھک جاتا تو جانے کتنی بار اپنی ناکامیوں اور حسرتوں پر چپکے چپکے رویا۔ محرومیوں کے احساس نے اسے تڑپایا۔ یہیں، ان سڑکوں پر گھومتے ہوئے اس نے اپنے مستقبل کو سنوارنے کے منصوبے بنائے۔ انہی سنسان راتوں میں اس نے بچوں کی طرح بند دکانوں کے شوکیسوں کو دیکھا۔ ٹنگے ہوئے خوب صورت کپڑوں کو اپنے جسم پر سجایا۔ ساریوں میں لپٹی ہوئی معصوم حسین مورتیوں کو اپنے سینے سے لگایا۔ مورتیوں کو دیکھ دیکھ کر سوچا کہ کیا زبان اور دماغ بے وفائی کی علامتیں ہیں اور یہیں اس نے بڑے فلسفیانہ انداز سے اپنے حساب بہت بڑی بڑی باتیں سوچیں۔ دنیا کے بے پناہ حسن کا اندازہ لگایا۔ یہیں اس نے جنگ اور امن کے مسائل پر غور کیا اور انہی سڑکوں پر چاندنی سے بھرپور ایک رات میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے گا۔ ایک دن تو وہ گھنٹوں یہ سوچ کر غصے اور خطرے سے لرزتا رہا تھا کہ پڑوسی ملک اس کے وطن کی سرحدوں پر فوجیں جمع کر رہا ہے۔ اسے اپنے پڑوسی ملک کی بدمذاقی پر افسوس ہوا تھا۔ کیا وہ ملک ویرانہ ہے؟ وہاں لوگ نہیں بستے؟ وہاں حسن جنم نہیں لیتا؟ جس ملک میں عورت بندیا لگاتی ہو، اس کے پاؤں میں بچھوا بجتا ہو، اور جہاں گنگا جمنا بہتی ہو، وہ جنگ کی باتیں کیسے کرتا ہے؟ اس نے عہد کیا تھا کہ اگر اس کے ملک پر ذرا سی بھی آنچ آئی تو وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے گا۔ مگر وہ اس مسحور کن فضا میں زہر نہ گھلنے دے گا۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس کے لاغر جسم میں جانے کہاں کی طاقت آگئی کہ وہ سینہ تان کر بڑی دیر تک لیفٹ رائٹ کے انداز میں چلتا رہا۔

وہ اپنے امکان بھر کبھی سرِشام گھر نہیں گیا۔ تنہا، ویران دو کمروں کا گھر اسے کھانے کو دوڑتا۔ گھر کے راستے پر اسے اپنی مرحومہ ماں یاد آنے لگتی۔ اس کی بیوہ ماں نے محنت مشقت کر کے اسے تعلیم دلائی تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرتے ہوئے سوچا کرتا تھا کہ اپنی اس تھکی ہاری ماں کو ایک دن سونے کے تخت پر بٹھا دے گا۔ مگر جب وہ ایم اے کا امتحان دینے والا تھا تو اس کی اماں ایسی تھکیں کہ سونے کے تخت کا بھی انتظار نہ کیا اور ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر لیٹ کر ہمیشہ کے لئے سو گئیں۔

گھر کی تنہائیوں میں اسے نجمہ یاد آتی- اس نے اسے فیل ہوتے دیکھ کر محبت اور منگنی دونوں سے منہ موڑ لیا اور ایک شاندار مستقبل والے سے شادی رچا کر رخصت ہو گئی- پھر وہ ایم اے نہ کر سکا- نجمہ کی بے وفائی نے اس کے مستقبل پر ایسی لات ماری کہ نفرت کے باوجود اسے کلرکی قبول کرنی پڑی-

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بے وفائی کا دکھ دنیا کے سارے دکھوں پر بھاری ہو جاتا ہے- رات سوتے میں بھی نجمہ اس کے سینے پر دھم دھم کر کے اسے روندتی رہتی اور وہ مارے اذیت کے پھر نہ سو پاتا- ان لمحوں میں اس نے کئی بار سوچا تھا کہ قانون میں قتل کی سزا پھانسی ہے مگر یہ بے وفائی کا جرم کسی قید و بند میں نہیں آتا! یہ بھی مزے کی بات ہے کہ سر توڑنا تو جرم ہے مگر دل توڑنا جرم نہیں! اگر وہ وزیر قانون ہوتا تو ضرور ایسا قانون بناتا کہ دل توڑنے والوں کو 'بیچ چوراہے' پھانسی دے دی جاتی- پھر وہ اپنی اس اوٹ پٹانگ سوچ بچار پر خود ہی بے بسی سے ہنسنے لگتا- اگر وہ وزیر قانون ہوتا تو پھر بے وفائی کا دکھ ہی کیوں سہتا-

نجمہ کو بھولنے اور خود کو بہلانے کے لئے اس نے بڑی ہماہمی سے زندگی گزارنی چاہی- اس نے کتنی ہی بار عورت کو خریدا مگر اسے سچی خوشی نصیب نہ ہوئی- اس نے ہر بار سوچا کہ عورت کو خریدنے کے لئے چاہے سب کچھ خرچ کر دو مگر گھاٹے کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا- اس کا گھر تو اور بھی ویران ہوتا جا رہا تھا- وہ جلد ہی اس چکر سے نکل گیا مگر کسی کو اپنا بناتے اور محبت کرتے بھی ڈرتا- نجمہ نے اس کی زندگی سے اعتماد چھین لیا تھا-

جنوری کی اس انتہائی سرد رات میں وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک چکا تھا- آج اس کے سارے جذبات اس کے گلے آ لگے تھے- آج اس نے اپنی تنہائی اور اداسی پر دل ہی دل میں خوب ماتم کیا تھا اور اس کے دل کا غبار چھٹ گیا تھا-

اب وہ تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا اور گھر پہنچ کر جلدی سے سو جانا چاہتا تھا- مال روڈ کی بڑی اور چھوٹی دکانیں' دیر ہوئی' بند ہو چکی تھیں مگر بڑی دکانوں کے شوکیس اسی طرح بقعۂ نور بنے ہوئے تھے اور چوکیدار موٹی موٹی لاٹھیاں پکڑے کھانس کھانس کر ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے- کہیں اکا دکا راہ گیر جاتا ہوا نظر آ

جاتا- ہاں کاروں کے لئے نہ رات تھی نہ سردی' جانے وہ کہاں سے آتیں اور زن سے غائب ہو جاتیں- کہر کی اس چادر کے اس پار کاروں کی پچھلی بتیاں دور تک جگنو کی طرح چمکتی رہتیں-

اب کہر کچھ زیادہ ہی پڑنے لگی تھی- سڑکوں پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کے بلبوں کی روشنی جیسے سردی میں ٹھٹھر کر اور بھی پیلی پڑ گئی تھی- وہ اپنے جسم کو گرم رکھنے کے لئے بڑی تیزی سے میکلوڈ روڈ کی طرف بڑھ رہا تھا-

فلموں کے آخری شو ختم ہو چکے تھے- تانگے' ٹیکسیاں اور رکشائیں حرکت میں آ چکی تھیں- کھوکھوں میں بیٹھے ہوئے پان بیڑی سگریٹ بیچنے والے اونگھتے اونگھتے چونک پڑے تھے- اس نے ایک لمحے کو رک کر تانگوں اور ٹیکسیوں کی طرف بے تحاشا لپکتے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور پھر چل پڑا-

کئی تانگے کھچاکھچ سواریاں بھرے قطار کے ساتھ اس تیزی سے اس کے پاس سے گزرے کہ اسے اپنی مرحومہ ماں یاد آگئیں- اگر وہ زندہ ہوتیں اور وہ جا کر اپنے بال بال بچنے کا حال سناتا تو ضرور صدقہ دیتیں-

اب وہ سینما گھروں کو اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا- تانگوں اور ٹیکسیوں کا دھاوا بھی ختم ہو چلا تھا- اس نے اب اطمینان سے تیز تیز چلنا شروع کردیا- گھر اب تھوڑی دور رہ گیا تھا-

"ہائے تم کو ابھی تک کوئی تانگہ نہیں ملا- انتظار کر کر کے تھک گئی-" پیچھے سے آکر کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا- اس نے مڑ کر دیکھا- سیاہ نقاب سے ایک چاند کا ٹکڑا جھانک رہا تھا- وہ اس وقت بجلی کے کھمبے سے دور تھا- وہاں اندھیرا تھا مگر وہ چہرہ کسی روشنی کا محتاج نہ تھا- عورت نے بڑی اپنائیت اور محبت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی طرف بڑھا دیا-

"تانگہ نہیں ملتا تو نہ سہی' ٹیکسی کرلو' گھر میں سب پریشان ہوں گے کہ دیر کیوں ہو گئی' تم بھی اتنی دیر سے سوؤ گے تو صبح کام پر کس طرح جاؤ گے-"

وہ مارے بوکھلاہٹ کے کچھ نہ کہہ سکا مگر عورت کا بڑھا ہوا ہاتھ جانے کیسے اس کے ہاتھ میں آگیا- یہ نرم ہاتھ مارے ٹھنڈ کے برف کا ٹکڑا ہو رہا تھا- اس

نے کچھ بھی سوچنے کی کوشش نہ کی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ عورت سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہے۔ وہ اس کے لئے ایک محبت کرنے والے شوہر کی طرح بے چین ہوگیا۔ اسے اس وقت یہ خیال ہی نہ رہا کہ عورت اس کی کچھ بھی نہیں لگتی۔ اس کھرپڑتی اندھیری رات نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کردیا ہے۔ وہ شوہر کے دھوکے میں اسے اپنا سمجھ بیٹھی ہے۔

"تم کو سردی لگ رہی ہے، بس ابھی تانگہ یا ٹیکسی مل جائے گی۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا اور جب مڑ کر دیکھا تو ان کے پیچھے ایک سپاہی کھڑا ان دونوں کو تک رہا تھا۔ "آپ کیسے کھڑے ہیں سنتری جی؟" اس نے ذرا غصے سے پوچھا۔ اسے فوراً خیال آیا کہ اس بے چاری عورت کو اکیلا دیکھ کر آگئے ہوں گے۔

"میاں جی، اس زمانے میں عورت کو اکیلا چھوڑ کر چلتے بھی نہیں۔ فلم دیکھنے کو غنڈے بھی آجاتے ہیں اور ہر عورت کو آوارہ سمجھنے لگتے ہیں۔ کچھ دور تانگہ مل جائے گا۔" سپاہی اپنی لاٹھی گھماتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

تم نے اس کا منہ ہی نہ توڑ دیا۔ یہ کون ہوتا ہے ہمیں نصیحتیں کرنے والا۔ میں نے تو لڑائی کے ڈر سے کہا نہیں۔ جیسے ہی تم تانگہ لینے گئے، یہ آکر میرے پیچھے منڈلانے لگا۔ پھر میں تمہارے پیچھے بھاگی اور اب دیکھو کیا چپکے سے آکر پیچھے کھڑا ہوگیا۔" مارے غصے کے عورت کی آواز بھرا رہی تھی۔

"چلو معاف کردو، غلطی تو میری ہے، تم کو چھوڑ کر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" اس کی آواز میں واقعی ندامت تھی۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ جب وہ اندھیرے سے گزر کر بجلی کے کھمبے کے پاس آیا تو اس نے شعوری طور پر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اسے خیال آرہا تھا کہ کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔ یہ مسرت سے بھرپور لمحے کہیں اتنی جلدی سے ختم نہ ہو جائیں۔

اس نے کئی مرتبہ چور نظروں سے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی خوب صورت تھی۔ اس کی ترستی ہوئی سیاہ زندگی پر اچانک چاند کا ایک ٹکڑا گر پڑا تھا۔

اس نے ایک لمحے کو رک کر مفلر سے اس طرح اپنا چہرہ چھپا لیا کہ صرف آنکھیں کھلی رہ جائیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان اڑتے ہوئے لمحوں کو پکڑنے کے لئے خود کو کسی طرح عورت کے شوہر کے روپ میں ڈھال لے۔ ایک عمر بیت جائے مگر وہ اسے نہ پہچان سکے۔ اسے یہ سب کچھ کتنا خوب صورت لگ رہا تھا۔

اس نے اپنا چہرہ گھما کر عورت کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی بڑی پیاری نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ گھبرا گیا مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر جیسے پھول کھل رہے تھے اور ہلکے ہلکے اندھیرے میں اس کی آنکھیں تیرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

"تم تھکیں تو نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں تمہارے ساتھ چلتے ہوئے پہلے کبھی تھکی ہوں۔" عورت نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے اس ننھے منے کنول کو اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ مگر جلد ہی اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ ہاتھ نہیں بجلی کا پاور ہاؤس ہے۔ یہیں سے تو بجلی کی لہریں پھوٹتی ہیں۔ اسی ہاتھ کے دم سے تو یہ سارا شہر روشن ہے۔

اس نے ایک گھٹی گھٹی سی سانس بھری۔ اس کا کیسا جی چاہ رہا تھا کہ اس سناٹے میں عورت کو سینے سے لگا لے مگر اس نے اپنے جذبے پر فوراً ہی قابو پا لیا۔ وہ اتنی معصوم، محبت کرنے والی اور خوب صورت عورت کی غلط فہمی سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے گا۔ وہ ایسی لچر حرکت کبھی نہ کرے گا۔ اس نے پھر اس عورت کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی اور اس کے سخت مردانہ ہاتھ کو بڑی گرم جوشی سے دبانے لگی۔

ایک لمحے کو اس کے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال کوند گیا کہ کہیں یہ کوئی ایسی ویسی عورت تو نہیں۔ کہیں اسے بے وقوف تو نہیں بنا رہی۔ جانے اسے کہاں لے جائے، کیا عورت کبھی اپنے شوہر کو پہچاننے میں بھی غلطی کر سکتی ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ وہ ذرا دیر کو چکرا کر رہ گیا۔ اب کے اس نے غور سے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ کس اعتماد اور معصومیت سے اس کے ساتھ چل

رہی تھی۔ پھر بھی اس کا دل صاف نہ ہوا۔ اس عورت ذات کا کیا اعتبار۔ اس نے خالص مردانہ انداز سے سوچا۔ آئے دن اخباروں میں کیسے کیسے واقعات آتے رہتے ہیں۔ کیا پتہ محض پولیس سے بچنے کے لئے اس نے سہارا ڈھونڈا ہو۔

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو آخر؟" عورت کا ہاتھ چھوڑ کر اس نے اچانک سوال کیا۔

"ایں!" وہ جیسے کچھ سوچتے سوچتے چونک پڑی۔ "میں چاہتی ہوں کہ اب تم کسی طرح بھی کوئی سواری کا انتظام کر لو۔ ننھا ضرور جاگ گیا ہوگا سلیم، وہ میرے لئے رو رہا ہوگا۔ ہائے وہ روتا ہوا بھی بڑا پیار لگتا ہے نا؟ بالکل تمہاری طرح ہے۔ ایسی ہی اس کی عادتیں بھی ہوں گی۔" عورت نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اچھا تو سلیم ہے اس کا نام! سچ مچ اس غریب کو دھوکا ہوا ہے، مگر وہ اسے کیا کہے، کون سا نام دے۔ نجمہ؟ اس نام سے اس کے کلیجے میں ہوک سی اٹھی۔ مگر یہ نجمہ کیسے ہو سکتی ہے۔ نجمہ تو پیدل چلنے اور مصیبتیں جھیلنے کے خیال سے ڈر کر اسے چھوڑ گئی۔ یہ تو اس کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے نہیں تھکتی۔ یہ نجمہ کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ اسے اپنا شوہر سمجھ کر کس پیار سے باتیں کر رہی ہے۔ اس کا شوہر سواری کی تلاش میں شاید آگے نکل گیا ہوگا اور اب واپسی پر کتنا پریشان ہوگا۔ کس طرح اسے تلاش کر رہا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل پر چوٹ سی لگی کہ اگر اس کا شوہر راستے میں مل گیا تو پھر وہ اسے چھین لے جائے گا۔ اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بس آگے جا کر کوئی سواری مل جائے گی۔ شاید دوسرے سنیما ہاؤس میں ابھی فلم نہ ختم ہوئی ہو۔"

"ہوں!" عورت نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے قدم اٹھانے لگی۔ راستہ بڑی خاموشی سے کٹ رہا تھا۔

"کتنی سردی ہو رہی ہے!" اس نے خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"ہوں!" عورت جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس نے صرف ایک بار اس کا ہاتھ محبت سے دبایا اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیا۔

اب اس شدت سے کہر پڑ رہی تھی کہ سامنے تھوڑے سے فاصلے پر بھی کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اس کا کوٹ مفلر دونوں ہی نم ہو رہے تھے۔ مگر اسے ذرا بھی سردی نہ لگ رہی تھی۔ اس کا تو جی چاہ رہا تھا کہ یہ کہر پڑتی رات کبھی نہ ختم ہو۔ قدرت نے یہ رات صرف اس کے لئے بنائی ہو۔

"تم کیا سوچ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ ننھا رو رہا ہوگا مگر سلیم، آج کتنی مدت بعد تمہارے ساتھ باہر آنا نصیب ہوا ہے۔ اتنے بہت سے لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے تو تمہارے ساتھ نکلنے کا خیال بس ستا کر ہی رہ جاتا ہے۔ سب کی مرضی کا لحاظ کر کے جیسے دم گھٹ گیا۔" عورت نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ٹھیک کہتی ہو، میرا دم خود گھٹتا رہتا ہے۔" اس نے جلدی سے ہاں میں ہاں ملائی۔

"وہ دیکھو تانگہ" —— عورت نے رک کر سامنے اشارہ کیا۔

اس نے تانگے والے کو آواز دی۔ وہ بے حد آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ کوچوان کمبل میں لپٹا شاید اونگھ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ آواز دی تو تانگہ ان کے قریب آکر رک گیا اور وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"کہاں چلنا ہے بابو جی؟" تانگے والے نے پوچھا۔

اس نے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہاں جانا ہے؟ کس گلی؟ کس محلے؟ یہ چاند کا ٹکڑا کس گھر میں اترے گا؟ اسے تو کچھ بھی پتہ نہ تھا۔

"کیا سوچنے لگے، تانگے والے کو جواب تو دو۔ رحمان پورے چلو بابا۔ یہ تمہاری ہر وقت کے سوچنے کی عادت نہیں جاتی۔" عورت ہولے سے ہنسی۔

"بھئی وہ میں سوچ رہا تھا کہ ننھا اگر اٹھ گیا تو ضرور رو رہا ہوگا اور ——" وہ چپ ہو گیا۔

"ہاں! میرا بچہ رو رہا ہوگا۔ لعنت ہے ایسے فلم دیکھنے پر۔" عورت نے دھیرے سے جواب دیا۔

رات، سناٹا اور پختہ سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز۔ اسے محسوس ہو

رہا تھا کہ عورت اب آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ ٹاپیں بھاگتے ہوئے لمحوں کے روپ میں اسے بری طرح بے چین کر رہی تھیں۔

اس نے گھبرا کر عورت کی طرف دیکھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اب وہ مسلسل اسے دیکھتا رہے۔ وہ اس صورت کا نقشہ اپنی آنکھوں میں کھینچ لینا چاہتا تھا۔

"کیا سوچ رہے تھے؟" عورت بڑے انداز سے گردن موڑے، کھوئی کھوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کچھ بھی نہیں!" اس نے نظریں جھکا لیں۔ کیسی مجبوری تھی کہ وہ اس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح تو وقت سے پہلے ہی پہچانا جاتا۔

"سلیم"۔ عورت نے جیسے خواب میں پکارا۔

"ہاں!" اس نے مفلر اچھی طرح لپیٹتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"اماں، بہنیں اور ہمارا نکھٹو آوارہ بھیا، سب جاگ کر انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہاں ان بے چاروں کو کیا پتہ کہ تانگہ نہیں مل رہا تھا اور ننھا بھی ضرور اٹھ گیا ہوگا، تم کو نہ پا کر رو رہا ہوگا۔" اس نے اس طرح ننھے کا ذکر کیا کہ واقعی اس کا دل پدری محبت سے پھٹنے لگا۔ اسے تو اس وقت یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ وہ کسی کا باپ نہیں۔

"ہاں رو رہا ہوگا۔" عورت نے اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے گہری نیند سو گئی ہو۔ اس کے چہرے پر عجیب سی آسیبی کیفیت طاری تھی۔ اس کی گردن اب بھی اسی انداز سے اس کی جانب مڑی ہوئی تھی۔

اب وہ اسے جی بھر کے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے یہ خطرہ نہ تھا کہ یوں دیکھنے پر وہ پہچان لے گی۔

مریل گھوڑا جیسے رینگ رہا تھا۔ تانگہ والے نے اسے دو چار چابکیں رسید کیں اور پھر کمبل میں ہاتھ چھپا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے عاجز آگیا ہو۔ سڑک پر

بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اب کوئی راہ گیر نظر نہ آتا تھا۔ سردی اس غضب کی ہو رہی تھی جیسے آج ہو کے پھر کبھی نہ ہو گی مگر وہ سردی اور سناٹے سب سے بے نیاز ہو کر عورت کو تکے جا رہا تھا۔

"سلیم"۔ عورت نے آنکھیں کھول دیں —— "تم بتاؤ اگر میرا بھائی اپنی ماں بہنوں کا بار نہیں اٹھاتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ سب بھوکے مرتے ہیں تو مرجائیں۔ میں تمہاری کمائی کا ایک دھیلا بھی ان کو نہ دوں گی، اگر تمہارے پاس بہت دولت ہوتی تو شاید میری وجہ سے ان کو سنبھال لیتے مگر اتنا ہے ہی نہیں۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ اتنے بہت سے لوگوں کا بار اٹھاتا پھرے۔ اتنے بہت سے بیمار اور بھوکے لوگ بھر گئے ہیں اس گھر میں۔ پتہ نہیں میں ان سب کے ساتھ کیسے رہتی ہوں۔ جی نہیں چاہتا کہ یہ سب مرجائیں۔ اپنوں کی محبت اندھی ہوتی ہے نا؟ اس نے اپنا چہرہ بازو میں چھپا لیا اور ایک ہلکی سی سسکی بھری۔

"سنو تو۔" اس نے بے چین ہو کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ عورت کے دکھوں کی پل صراط سے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا اور جب وہ اس دھار دار راستے پر کٹ کر گرنے والا تھا تو عورت نے اپنا سر اوپر اٹھا لیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی گود میں ڈال کر مسکرانے لگی۔ وہ کٹ مرنے کی اذیت سے نکل کر خود بھی ہنس پڑا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر اسے کتنی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

"دنیا میں اتنی بہت سی مجبوریاں کیوں ہوتی ہیں سلیم؟" وہ پھر رنجیدہ ہونے لگی۔

"بس ہوتی ہیں۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر مارے ہمدردی کے دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ "تم یہ سب مت سوچا کرو پگلی۔"

"سوچنا تو پڑتا ہے، اگر اللہ میاں نے انسان کو دماغ نہ دیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"مگر اس وقت تو نہ سوچو۔" اس نے عورت کا سر اپنے بازو پر ٹکا لیا تو اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔

تانگہ اب مزنگ چونگی کے چوراہے سے گزر رہا تھا۔ چوراہے کے ساتھ والی دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ ملازم لڑکے کوکا کولا کی خالی بوتلیں سمیٹ رہے تھے۔

"ارے، کیا مزنگ چونگی آگئی۔" عورت نے جیسے چونک کر دکانوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" اس نے بڑے دکھ سے جواب دیا اور پھر عورت کی طرف دیکھا جو سامنے کہیں جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اب تک اس کی گود میں پڑا تھا۔

مزنگ بھی اب پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب ذرا دیر بعد رحمان پورہ آجائے گا۔ اس کی خوب صورت محبت کرنے والی بیوی اس سے چھٹ جائے گی۔ اس کا پیارا ننھا جو بالکل اس کا سا ہے، اسے کبھی ابا نہ کہہ سکے گا۔ سب کچھ چھٹ جائے گا۔ کاش وقت تھم جائے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ سائنس دان کوئی ایسی ایجاد بھی کرتے جس سے بھاگتے ہوئے لمحوں کو پکڑا جاسکتا۔

"یہ گھوڑا اتنی زور سے دوڑ رہا ہے، مجھے تو ڈر لگتا ہے۔" اس کی آواز میں خوف تھا۔

"ہاں آہستہ چلاؤ، کہیں تمہارا گھوڑا پھسل نہ جائے۔" اسے بھی اچانک احساس ہوا کہ گھوڑا تیز چل رہا ہے۔

"بابو جی، یہ تو اپنی زندگی میں کبھی تیز چلا ہی نہیں چاہے کھال نکال لو اس کی اور آپ کہتے ہیں کہ تیز چل رہا ہے۔" تانگے والا جیسے ان کی سمجھ پر زور سے ہنسا۔

تانگے والے کی ہنسی پر وہ شرمندہ ہوگیا۔ گھوڑا تو واقعی بے حد آہستہ چل رہا تھا پھر بھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ گھوڑا اور آہستہ چلے، بلکہ چل ہی نہ سکے۔ اس انتہائی سردی میں اس کے پاؤں شل ہو جائیں اور پھر ساری رات، ساری زندگی وہ عورت کا ہاتھ تھام کر سڑک کے کنارے بیٹھا رہے۔

"سلیم، میں سوچتی ہوں کہ ——" وہ چپ ہوگئی۔

"یہی نا کہ اب ننھے کو چھوڑ کر تفریح کرنے کبھی نہ نکلوں گی، بس ابھی گھر آیا چاہتا ہے۔" اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسے کبھی نہ چھوڑوں۔" اس نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری اور پھر قریب سرک کر اپنا سر اس کے سینے پر ٹیک دیا —— "مجھے چھپا لو، گھر جانے کو جی نہیں چاہتا ——" وہ سرگوشی میں کہنے لگی۔ "وہاں تو درجن بھر جان کے دشمن سر پر دندناتے رہتے ہیں۔ تمہارے پاس بیٹھنے کو تو ایک منٹ بھی نہیں ملتا، مجھ سے تمہارے متعلق سوچا بھی نہیں جاتا ——" وہ اپنا سر اس کے سینے پر رگڑنے لگی۔

"اور مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم کو پا کر بھی کھو دیا۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ وہ اور بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کی زبان ساتھ نہ دے رہی تھی۔ وہ اس وقت جذبات کی شدت سے بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ صرف ایک بار عورت کو اپنے سینے سے لگانے کی خواہش میں مرا جا رہا تھا مگر وہ صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اسے عورت میں ایسا تقدس اور معصومیت نظر آ رہی تھی کہ وہ اپنی اس چھوٹی سی خواہش کو بھی پورا کرنے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔

اب تانگہ رحمان پورے کی سڑک پر مڑ گیا تھا۔ دور دور لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کے بلب اسے پکے پھوڑوں کی طرح ٹپکتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے، اب سب کچھ چھن جانے کا احساس اسے بری طرح ستا رہا تھا۔ جانے کس گلی میں کس گھر میں اس کی بیوی اور اس کا بیٹا اس سے جدا ہو کر ہمیشہ کے لئے اسے تڑپتا چھوڑ جائیں گے۔

اس نے سوچا کہ وہ تانگے سے اترتے ہی عورت کو خود بتا دے گا کہ رات کی تاریکی نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے، وہ اس کا شوہر نہیں۔ کیا فائدہ کہ وہ خود ہی اسے پہچان لے اور جانے کیا سمجھے۔ بے ایمان، ذلیل، مگر اس نے ذلیل پن کی تو کوئی حرکت نہیں کی، وہ اسے بتا دے گا کہ وہ اس قدر پیاری ہے کہ اس نے صرف تصور میں اسے اپنا بنا لیا تھا اور سوچنا گناہ نہیں ہے۔ خواب دیکھنا کمینگی نہیں ہے۔

اسے اپنا ضمیر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہولے سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر سے اٹھا لیا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اب اس نے جینے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور مارے کرب کے کسمسانے لگا۔

"کیا بات ہے سلیم" اس نے بیتابی سے اس کے کوٹ کا کالر کھینچا۔

"کچھ بھی نہیں!" اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی وہ اس عورت کو بھول سکے گا۔ "سلیم میرے پاس اور سرک جاؤ۔" اس نے پھر اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔

"میں تمہارے پاس ہی تو ہوں۔" اس نے اس طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ دو سال کی بچی ہو۔

تانگہ اب رحمان پورے کی ایک گلی میں مڑ گیا تھا۔ پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر کئی آوارہ کتے سامنے آ کر بھونکنے لگے تھے۔ گلی بالکل تاریک تھی اور یہاں کہر کی چادر اور بھی موٹی ہو گئی تھی۔

"ارے تم نے تو بتایا ہی نہیں، تانگہ آگے نکل جاتا۔" اس نے برقعے کے اوپری حصے کو ٹھیک سے اوڑھ لیا۔ "بس یہاں روک لو۔ آگے گلی میں تمہارا تانگہ نہ جا سکے گا۔"

تانگہ رکتے ہی وہ اتر گئی۔ مگر وہ اپنی سیٹ پر جیسے جم کر رہ گیا تھا۔ اس کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ اسے گزرے ہوئے وقت کا یہ انجام بڑا ہی المناک معلوم ہو رہا تھا۔

"اترو نا"۔ عورت نے کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ بڑھایا تو وہ کٹھ پتلی کی طرح نیچے آ گیا اور تانگے والے کو کرایہ دینے کے لئے بٹوہ تلاش کرنے لگا۔

جب تانگے والا تانگہ موڑ کر چلا گیا تو اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ بھلا وہ اترا ہی کیوں تھا، اسے تو اسی تانگے سے واپس چلا جانا چاہیے تھا۔

وہ بڑی مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے اس طرح چل رہی تھی جیسے رینگ رہی ہو۔ گلی کے موڑ پر وہ کھڑا ہو گیا تو وہ بھی رک کر اس کا منہ تکنے لگی۔

"میں ——— میں، میں کہنا چاہتا ہوں کہ ———" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"یہی نا کہ تم میرے شوہر نہیں ہو۔ ابھی کچھ دیر اور نہ کہتے تو اچھا ہوتا، کچھ وقت اور کٹ جاتا۔" وہ جیسے کنوئیں میں سے بولی۔ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"شاید تم کو میرے اس طرح چھپانے پر افسوس ہوا مگر میں نے کوئی بے ایمانی تو نہیں کی، تم کو حفاظت سے یہاں تک پہنچا دیا۔ بہرحال میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ بات یہ تھی کہ ــــ" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا۔ اس نے عورت پر بھرپور نظر ڈالی۔ "ننھے کو میری طرف سے پیار کرنا ــــ" اس کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔

"'ننھا' جو بالکل تمہارے جیسا تھا، جو راستے میں پیدا ہوا اور میرے اس گلی میں آنے کے بعد مر گیا۔" عورت سسک کر رو پڑی۔ "اب کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ بھاگ جاؤ ــــ" اس نے اپنا برقع کھسوٹ کر بغل میں دبا لیا۔ "اب اتنے بہت سے بھوکے تمہاری جان کو روئیں گے۔ میں خالی ہاتھ گھر جا رہی ہوں۔" اس نے جلتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے دوسری گلی میں مڑ گئی۔ مگر وہ دکھ اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے بوجھ تلے دبا اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ سناٹے میں عورت کے جوتوں کی ایڑیوں کی کھٹ کھٹ اور سسکیوں کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوتے جانے کہاں کھو گئی۔ اب اسے اچانک اپنے لٹ جانے کا احساس ہوا اور وہ پاگلوں کی طرح گلی میں دوڑا مگر اب وہاں خاموشی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ ان کی کھڑکیوں سے اندھیرا پھوٹ رہا تھا۔ کہیں روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہ آئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں کے ایک ایک دروازے کو پیٹ کر اس کا پتہ پوچھے۔ اس کی تلاش میں نگر نگر ڈھنڈورا پیٹے۔

اور جب وہ دکھوں کے بوجھ سے نڈھال ہو کر واپس ہو رہا تھا تو گلی کے ویران اندھیرے میں ایک ننھی سی کفنائی ہوئی لاش تیر رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا، سڑک پر آ گیا جہاں کنارے پر کھڑا تانگے والا بجھی ہوئی بتیوں میں تیل ڈال رہا تھا۔ وہ اچک کر تانگے پر بیٹھ گیا۔

"اب کہاں چلنا ہے بابو!" تانگے والا ایک آنکھ میچ کر ہنسا۔

"میکلوڈ روڈ۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا اور جب اپنے ٹھنڈے سے برف چہرے کو اس نے دونوں ہاتھوں سے رگڑا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ رو رہا تھا۔

# بھورے

محمد بھورے ولد محمد بوٹے کے دماغ میں کوئی خلل پیدا ہوگیا ہے۔ یہ سب کا متفقہ فیصلہ تھا مگر مس لال خاں ہاؤس سرجن کا خیال تھا کہ ان کے دماغ میں کوئی خلل نہیں ہے کیوں کہ وہ بقائمی ہوش و حواس تمام کام انجام دیتا ہے۔ اگر گھنٹے کی آواز سے اس پر بے چینی طاری ہو جاتی ہے تو یہ کوئی جذباتی معاملہ ہے۔

محمد بھورے سے اس معاملے میں تقریباً" سبھی نے پوچھ گچھ کی مگر جواب میں اس نے ہمیشہ دانت نکال دیئے اور اس طرح ہنسا جیسے سب کو چڑا رہا ہو۔ مس لال خان نے اس معاملے میں بھورے سے بڑی راز داری کے ساتھ معلومات حاصل کرنی چاہیں مگر وہ ان کی ہمدردی اور خلوص کو بھی بڑی بے اعتنائی سے ٹال کر صرف تنہا رہ گیا۔ آخر کار مس لال خان کا بھی خیال بدل گیا اور انہیں بھی ماننا پڑا کہ یہ خلل ہے مگر لمحاتی' جو گھنٹے کی آواز سے پیدا ہوتا ہے اور ختم ہوجاتا ہے۔ اس لئے بھورے بے ضرر سا انسان ہے اور اسے اپنی ملازمت پر موجود رہنا چاہیے۔

محمد بھورے اپنی ملازمت پر موجود رہا مگر یہ کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ یہ ایک کہانی ہے جو بھورے کسی کو نہیں بتانا چاہتا اور وہ اس کہانی کے ایک بڑے ہی مسرت انگیز انجام کا منتظر ہے۔ یہ کہانی اس طرح ہے کہ:

سیتا پور کا مہاجر محمد بھورے اس زنانہ امراض کے اسپتال میں آٹھ سال سے کام کررہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اسپتال کے اس ٹیلی فون پر لگی ہوئی تھی جو ہاؤس سرجنوں اور ٹریننگ حاصل کرنے والی لڑکیوں کے لئے وقف تھا۔ دوسرا ٹیلی فون جو دوسری طرف تھا' مریضوں اور ان کے سرپرستوں کے لئے وقف تھا۔ دونی ڈبے

میں ڈال کر جس کا جی چاہے فون کرے۔ اس دوسری طرف ہر وقت ہلڑ سا مچا رہتا۔ اس کے باوجود ٹیلی فون کا چپراسی پرائیویٹ کمروں کے مریضوں کو پیغام بھی پہنچا دیتا اور مریض خوش ہو کر اسے انعام بھی دے دیا کرتے، اس طرح خاصی آمدنی ہو جاتی مگر بھورے اس آمدنی اور اس ٹیلی فون، دونوں سے توبہ کرتا تھا۔ اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کہ اس کی ڈیوٹی دوسرے ٹیلی فون پر تبدیل کردی جائے۔ وہاں پر قریبی لیبر روم سے آتی ہوئی چیخیں صاف سنائی دیتیں۔ سب بدحواس سے نظر آتے مگر یہاں اس طرف بڑی بڑی محرابوں والے برآمدے میں ہر وقت سکون طاری رہتا۔ سامنے وسیع لان کے درختوں پر چڑیاں چہکا کرتیں۔ گرمیوں میں لو کے گرم جھونکے بھی برآمدے تک آتے آتے ٹھنڈے ہو جاتے۔ سردیوں میں چمکیلی دھوپ گھنٹہ دو گھنٹے برآمدے میں لوٹتی رہتی اور برسات میں جب چھم چھم بارش ہوتی تو کبھی کبھی بوچھار برآمدے کی محرابوں سے داخل ہو کر بھورے کے قدموں کو بھگو جاتی۔ یہاں کے سناٹے کے اور بھی بہت سے فائدے تھے۔ یہاں وہ آزادی سے جوان آیاؤں اور بوڑھی آیاؤں کی لڑکیوں سے عشق لڑا لیتا تھا۔ اتوار اتوار فلموں کے میٹنی شو دیکھنے کی وجہ سے اس کو عشق کرنے کے ہزاروں طریقے معلوم ہو گئے تھے۔ تنخواہ کا آدھا حصہ تحفوں میں خرچ کرنے کے بعد بھی بھورے کی زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ اس کی زندگی میں صرف اس چیز کی کمی تھی کہ اس کی محبوبائیں فلمی ہیروئنوں کی طرح نہ تو اس سے محبت کرتی تھیں اور نہ باوفا تھیں بلکہ ویمپوں کی طرح بے وفا اور ہرجائی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اور بہت سوں سے بھی تحفے وصول کرلیتی ہیں، وہ اپنی محبوباؤں کو جی جان سے بدمعاش سمجھتا تھا۔ اسی لئے اس نے اب تک شادی نہ کی تھی اور نہ اسے شادی کی ضرورت ہی محسوس ہوئی تھی۔ مہاجر بننے کے بعد شادی کا تصور اس کے ذہن میں دھندلا کر رہ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب بندر بارش میں بھیگتا ہے تو اسے گھر بنانے کا خیال آتا ہے مگر بھورے انسان تھا اور بارش سے سر بچا سکتا تھا۔ اس لئے اسے گھر بنانے کی کیوں فکر ہوتی۔ ویسے بھورے کو شادی سے نفرت بھی نہ تھی۔ البتہ شادی کرنے کے لئے جس قسم کی پاک دامن اور محبت کرنے والے بی بی کی

ضرورت ہوتی ہے' وہ اسے اب تک نظر نہ آئی تھی۔ اس لئے وہ زندگی سے خوش اور مطمئن تھا۔ مقدور بھر عیش کر رہا تھا۔ ملازمت میں بھی کوئی تکلیف نہ تھی۔ سارا دن میلی پرانی آرام کرسی پر پڑا فون ریسیو کرتا یا پھر گایا کرتا۔ جب وہ سیتا پور میں تھا تو راتوں کو اپنی ٹولی کے ساتھ تھالی بجا کر بارہ ماسے گایا کرتا تھا۔ اس کے ساتھی اس کی سپاٹ آواز کی تعریف کرتے تھے۔ یہ وہی تعریف تھی جس نے آج تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ نئے فلمی گانوں سے اسے بڑی نفرت تھی۔ وجہ یہ تھی کہ بڑی کوشش کے باوجود وہ ان ٹیڑھے میڑھے فلمی گانوں کی دھن نہ اتار سکا تھا۔ ان دھنوں کی نقل کرتے ہوئے اس کی آواز جواب دے جاتی' اس لئے اسے اپنے وہی پرانے گانے جی جان سے پیارے تھے۔ سیتا پور چھوڑے دس سال ہو گئے تھے مگر وہ ان گیتوں کا ایک آدھ بول ہی بھول سکا تھا۔

لاہور میں بھورے بالکل اکیلا تھا۔ ماں باپ سیتا پور ہی میں مر چکے تھے اور خالہ جس نے اسے پالا تھا' سیتا پور ہی میں رہ گئی تھی۔ خالہ نے اس کے صرف ایک خط کا جواب دیا تھا۔ اس کے بعد بھورے نے کئی خط لکھے مگر کوئی جواب نہ آیا تو اس نے سمجھ لیا کہ بے چاری بوڑھی مرکھپ گئی ہو گی۔ دکھ پالو تو جوان ہو ہو کر ستاتے ہیں مگر پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دو تو فرصت مل جاتی ہے' بھورے بھی کچھ اسی طبیعت کا آدمی تھا لیکن جب سے اس کو یہ محبت کا روگ لگا تو دنیا ہی بدل گئی' آیائیں اور اس کالی لوکٹ نرس کی لونڈیا اس کے سامنے مٹک مٹک کر تھک گئیں پر بھورے نے ان کو کوئی تحفہ نہ دیا۔ ایسا جی اچاٹ ہوا کہ پھر تفریحاً" بھی ان پر محبت کی نظر نہ ڈالی۔ رات اس کے کوارٹر میں آنے کا مژدہ سنا کر للچاتیں تو وہ جیسے بہرہ بن جاتا۔ اس طرح چار پیسوں کے لئے آخر کون پیچھے پھرتا رہتا۔ وہ سب بھی اسے پاگل سمجھ کر چھوڑ گئیں۔

پہلی بار جب اس نے ظہورن کو بے دردی سے دھتکارا تھا تو بظاہر اسے محسوس نہ ہوا تھا مگر جب وہ تھکے تھکے قدم ڈالتی' اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ذرا ہی دیر بعد بھورے کو ایسا لگا کہ ایک پھانس ہے جو دل کے پاس کھٹک رہی ہے۔

بھورے نے جی بہلانے کے لئے الاپنا شروع کیا:

نہ تم سے دل کو لگاتے نہ غیر کہلاتے

گلوں میں بیٹھتے گلزار کی ہوا کھاتے

ہوں —— ہوں —— ہوں —— ہوں۔ ارے ہاں مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے۔ پھر وہ لمبی سانس لے کر میلی پرانی آرام کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ آج جنے ساری فون کرنے والیاں کہاں مر گئیں۔ اس نے اپنی سیکنڈ ہینڈ گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج گئے۔ ابھی تو کلاسیں بھی نہ ختم ہوئی ہوں گی۔ تم کو مسٹر بھورے یوں ہی جلدی مچی رہتی ہے۔ ابھی وقت ہی کیا ہوا ہے۔ وہ پاجیوں کی طرح مسکرایا۔ نیچی کرسی پر بیٹھ کر اونچے پر ہاتھ مارنا بھورے کے بس میں نہ تھا مگر نظروں پر کون اونچ نیچ کی چھاپ لگا سکتا ہے۔ فون کرنے والیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں مزے لوٹ لیا کرتا۔

فون کرنے والے بہت سے چہرے اس کے سامنے ناچ گئے۔ اس نے مسرت سے آنکھیں بند کر کے کرسی پر لیٹنے کے انداز میں پاؤں پھیلا دیئے مگر لمحے بعد پھر وہی اکتاہٹ اور افسردگی اس کے دل میں گھمسان کا رن ڈالنے لگیں۔ آج تو کسی خیال سے بھی اسے پہلی جیسی خوشی نہ مل رہی تھی۔ وہ پھر گانے لگا:

ہوائیں کوچے سے ہر طرح کی ترے آئیں

سزائیں دل کے لگانے کی سینکڑوں پائیں

ہاں ہاں —— ہوں ہوں ——

مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے

تیسرا مصرع بیتے ہوئے برسوں نے ذہن سے نکال پھینکا تھا۔

چلی گئی تو کیا ہو گیا؟ ایسی ایسی بہت پھرتی ہیں۔ مسٹر بھورے تم کو کیا کمی ہے؟ مایوسی کے دن میں اس نے مسرت کا جھنڈا لہرانا چاہا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس سائیڈ پر سالی کیسی خاموشی رہتی ہے۔ آج بھورے کو یہ جگہ بری معلوم ہونے لگی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ ادھر ہوتا، اس طرف کے ٹیلیفون پر اس کی ڈیوٹی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ہر وقت آنے جانے والوں کا شور، عورتوں کے چیخنے

چلانے کی آوازیں۔ سالے سارے خیال ویال بھاگ کھڑے ہوتے ہیں' دماغ میں تو بھس بھر جاتا ہے' انسان کی ذات سے نفرت ہو جاتی ہے اور یہ عورت ذات کیسی ڈھیٹ ہوتی ہے۔ بچہ جنتے ہوئے کتنا شور مچاتی ہے۔ چیخ چیخ کر کان کھا لیتی ہے۔ جنم جنم کے لئے بچہ پیدا کرنے سے توبہ کرتی ہے اور پھر سال کے اندر پیٹ پھلائے اسی اسپتال میں آتی نظر پڑتی ہے' کیسا عجیب سا لگتا ہے۔

اور پھر جانے کہاں سے ایک خیال بھورے کے دماغ میں آگھسا —— جو میں نے ظہوریا سے شادی کر لی ہوتی تو ایک وہ بھی یہاں آتی۔ میں ساری رات لیبر روم کے دروازے پر کھڑا اس کی چیخیں سنتا رہتا۔ جنے سنتا کہ بھاگ کھڑا ہوتا! چیخوں سے تو دل دکھتا ہے۔ بھورے نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ جنے کہاں چلی گئی ہوگی۔ اس عورت ذات کا دل تو دیکھو' اتنی بڑی دنیا بنا دی اور اس کی کوئی عزت نہیں کیسا دھتکار دیا تم نے بھورے۔ زور سے گھنٹہ بجنے کی آواز آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی اور مریضہ آگئی ہے۔ پرلی طرف کے گیٹ کا چوکیدار سامنے کے لان سے ہوتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ بھورے اچک کر کھڑا ہوگیا۔ "کتھے سے آ رہے ہو بادشاہو" اس نے ہنس کر ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے وقت بے وقت کے لئے پنجابی کے تھوڑے سے لفظ سیکھ لئے تھے جو وہ اپنی زبان کے ساتھ ملا کر استعمال کر لیا کرتا۔ "آؤ دو سوٹے ہو جائیں سگرٹ کے۔" بھورے نے جیب سے بگلا سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"یار تیرے تو مزے ہیں' ٹھاٹ سے بیٹھا رہتا ہے۔" چوکیدار نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ "میرے پھاٹک سے ابھی ایک عورت کی لاش گئی ہے۔ بس جی خراب ہوگیا' ادھر وہ گئی ادھر دوسری آگئی بچہ جننے۔"

"ہاں!" بھورے نے بجھی سی آواز میں کہا' اسے یک دم خیال آیا کہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اس کی ماں بھی مر گئی تھی۔ یہ بات اس کی خالہ نے اسے بتائی تھی۔

"یار یہ عورت ذات کیسی جیالو ہوتی ہے؟" بھورے نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ "لوگ تو یونہی بھی اس عورت ذات کے پیٹ میں بچہ ڈال دیتے ہیں۔ کتنا

دکھ جھیلتی ہے یہ عورت"۔ بھورے کا جی بھر رہا تھا۔ اسے پھر ظہورن یاد آ رہی تھی۔

"جیالو' اوئے رہنے دے' یہ عورت ذات بچہ نہ پیدا کرے تو جانو اس پر ساری دنیا کا دکھ پھٹ پڑتا ہے۔ اپنی خوشی سے کرتی ہے' پھر اتنی گندی ہوتی ہے یہ عورت ذات۔" چوکیدار نے نفرت سے شانے سکوڑے اور جانے کے لئے کھڑا ہوا۔ پھر سرگوشی کے انداز سے بولا۔ "بیئر کی پوری بوتل لے آیا ہوں۔ دل کرے تو رات میرے کوارٹر میں آ جا' تجھے بھی چاند تارے دکھا دوں۔"

بھورے صرف ہنس کر رہ گیا۔ اس وقت چوکیدار کی کوئی بات اچھی نہ لگی تھی۔ اس وقت تو اسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ بھلا ماں کس طرح گندی ہو سکتی ہے اور پھر یہ پینے پلانے کی بات۔ اس نے ایک دن پی تو تھی مگر ذرا سی پی کر گھوم گیا تھا۔ اسی وقت مس زیدی آ گئی تھیں۔ وہ کرسی سے بھی نہ کھڑا ہوا اور بیٹھا گاتا رہا تھا۔ "کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو" مس زیدی نے اسے بڑے زور سے ڈانٹا تھا۔ "تم کو کیا ہو گیا ہے' تمہاری رپورٹ ہوگی۔"

"دارو پلائے دی اپنے یار نے' ماپھی دیو مس صاحب۔" نشے کی حالت میں وہ اردو انگریزی اور پنجابی کے سارے الفاظ بھول گیا تھا اور صرف اپنی مادری زبان یاد رہ گئی تھی۔ مس زیدی کو ایک دم ہنسی آ گئی تھی تو وہ گڑگڑا کر رونے لگا تھا۔

"آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا' تم تو بہت اچھے ہو بھورے۔" مس زیدی فون کر کے چلی گئیں تو بھورے اس فکر میں دم بخود پڑا رہا تھا کہ کہیں اس کی شکایت نہ ہو جائے مگر مس زیدی نے شکایت کرنے کے بجائے خوب قہقہے لگائے تھے اور سب کو بتایا کہ بھورے پی کر ان کے تیر سیدھے کرا رہا تھا۔

ادھر ادھر کی باتوں کو یاد کرتے کرتے بھورے نے تھک کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ اوپر کی سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ ہو رہی تھی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس آواز سے وہ سمجھ جاتا کہ کوئی فون کرنے آ رہا ہے۔ برآمدے کی اوپر والی منزل پر بہت سے کمرے تھے جہاں طالب علم اور ہاؤس سرجن لڑکیاں رہتی تھیں۔

وہ ان سب کے نام اور ہسٹریاں جانتا تھا۔ کون کسے فون کرتا ہے۔ کون کس کا دوست ہے۔ کون محبت میں کامیاب ہوگیا ہے اور کون ناکام۔ رات کس نے آنسو بہائے تھے۔ کس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، کون سکون سے سویا تھا۔ کس کا ملنے والا آیا تھا۔ کون سی فلم دیکھی تھی۔ شادی کا کب تک ارادہ ہے۔

مس لال خان مسکراتی ہوئی فون کے پاس آئیں تو بھورے کھڑا ہوگیا۔ "ہلو، ناصر بول رہے ہو، ہوں ہوں۔ نہیں بھئی، ہائے میں مرگئی تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ اچھا کل ضرور آنا، خدا حافظ۔"

مس لال خان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں آپ ہی آپ مندی جا رہی تھیں۔

مس لال خان کے جانے کے بعد بھورے نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ سب یہی کرتے ہیں، سب ایک جیسے ہوتے ہیں بھورے۔ ظہوریا کب آئے گی؟ وہ آئے گی تو وہ اسے سینے سے لگالے گا —— ارے! وہ اپنے اس خیال پر چونک پڑا۔ بھلا اسے یہ خیال آیا ہی کیوں۔ وہ تو خواہ مخواہ اسے یاد کر رہا ہے۔

رکھی آپا کی لڑکی بڑے ٹھسے سے اس کی طرف آرہی تھی۔ بھورے نے شوق سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ لجاتی ہوئی اس کے پاس کھڑی ہوگئی۔ بھورے نے ادھر ادھر دیکھ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

"ابھی بازار نہیں گئے، کب لاؤ گے میرا کپڑا؟" وہ اترا رہی تھی۔

بھورے نے اس کے بھرے بھرے جسم پر کئی چٹکیاں لے لیں —— "لا دوں گا ڈیئر۔" برآمدے کے پرلی طرف سے کوئی آرہا تھا۔ لڑکی جیسے بڑی مصروفیت کے ساتھ جلدی سے آگے بڑھ گئی اور بھورے کو محسوس ہوا کہ اس کی طبیعت ذرا کھل گئی ہے۔

سکون کی ایک سانس لے کر وہ کرسی پر پھیل کر لیٹ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی اس نے سوچا کہ کل آپا کی لونڈیا کو کچھ نہ کچھ ضرور لادے گا۔ اسے اپنی انگلیوں میں چٹکیوں کی لذت محسوس ہو رہی تھی۔

ایک بار پھر گھنٹے کی تیز آواز گونجی تو اتنی مشکل سے پیدا کی ہوئی لذت ایک

دم رفو چکر ہو گئی۔ اس کا جی دکھ گیا۔ اسی طرح تو ظہوریا بھی آتی ہو گی۔ اکیلی پڑی رہتی ہو گی اور کوئی دور دور پوچھنے والا نہ ہوتا ہو گا۔

اس کی نظر برآمدے کے اس ستون کی طرف اٹھ گئی جو اس کے ٹیلی فون سے تھوڑی دور تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس وقت بھی ظہورن وہاں لیٹی ہے

---

وہ برسات کی ایک دوپہر تھی۔ اس دن ہوا بند تھی اور مارے امس کے جی گھٹا جا رہا تھا۔ بھورے اپنی کرسی پر بیزار پڑا اونگھ رہا تھا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ کوئی دبے قدموں اس کے پاس سے گزر گیا ہے۔ اس نے آنکھ کھول دی۔ چوڑی چوڑی نیلی دھاری کی قمیص اور مردانہ سا پاجامہ پہنے جنرل وارڈ کی کوئی مریضہ ستون کے پاس دری کا ٹکڑا بچھا رہی تھی۔ وہ تو سمجھا تھا کہ کوئی اس کی اپنی ہو گی اور ذرا وقت مزے سے گزر جائے گا۔ اس نے بڑی بے اعتنائی سے منہ پھیر کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ جنرل وارڈ کی زچائیں گرمی سے گھبرا کر ادھر آ جاتیں۔ کھلی فضا اور سناٹے میں ذرا دیر غفلت کی نیند سو کر چلی جاتیں۔

بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے آسمان پر اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے راہ میں دھول اڑ رہی ہو۔ سامنے لان میں بڑھی ہوئی گھاس پر ایک ہد ہد جانے کیا چگ رہا تھا اور بڑے اونچے پر کوئی چیل پر پھیلائے اڑی جا رہی تھی۔ اس وقت بھورے نے اکتا کر آنکھ کھول دی۔ ساری قمیص پسینے سے تر ہو رہی تھی اور وہ عورت بھی اب اٹھ کر برآمدے کے ستون سے سر ٹیکے بیٹھی جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ بادلوں کے دو چار چھوٹے چھوٹے سیاہ ٹکڑے کہیں دور سے سفر کرتے ہوئے سامنے آ گئے تھے۔

عورت ہولے ہولے گانے لگی:

بنوا تلے ڈولا رکھ دے مسافر، آئی ساون کی بہار رے

بھورے نے چونک کر ادھر دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ عورت اسے سنانے کے لئے گا رہی ہے:

اپنے محل میں گڑیاں کھیلت تھی سیاں نے بھیجے کہار رے

عورت کی آواز ذرا سی اونچی ہو گئی مگر اس کا سر اسی طرح برآمدے کے ستون سے ٹکا ہوا تھا۔ ویسے تو بھورے کو اسپتال میں آ کر بچے پیدا کرنے والی عورتوں سے ذرا دل چسپی نہ تھی مگر آج جانے کیوں اس عورت کا وجود اس کے لئے کشش کا باعث ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ عورت ہو گی مزے دار۔ کرسی سے اچک اچک کر دیکھنے کے باوجود اسے اس کا چہرہ نظر نہ پڑا۔ ستون اس کے چہرے کی آڑ کر رہا تھا۔

بھورے شرارت سے کھنکارا۔ اس وقت وہ بھول گیا تھا کہ اس حرکت پر اس کی شکایت بھی ہو سکتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ عورت صرف اسے سنانے کے لئے گا رہی ہے۔ آخر اور بھی تو عورتیں تھیں۔ کانکھتی کراہتی آتیں اور لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیتیں۔ گانے کوئی نہ بیٹھتا۔

کھنکارنے کی آواز پر عورت یوں چپ ہو گئی جیسے سچ مچ ڈولے میں سوار ہو کر سیاں کے گھر چلی گئی ہو۔ چند منٹ تک وہ یوں ہی سر ٹیکے خاموش بیٹھی رہی، پھر دری کا ٹکڑا سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

جب وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بھورے کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے بڑی نفرت سے بھورے کی طرف دیکھا اور پھر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ "ارے تو سیتا پور کا بھورے ناہیں ہے؟

"اور تو ظہورن ہے نا؟"

دونوں کی نظروں میں اضطراب تھا۔ عورت نے شرما کر دوپٹہ ماتھے تک کھینچ لیا اور نظریں جھکا لیں۔ بھورے کرسی سے اچھلا اور پھر بیٹھ گیا۔ کلیجے پر چوٹ سی لگی۔

وقت نے پلٹ کر دیکھا۔ بھورے کی خالہ نے ظہورن کی پیدائش پر ٹھیکرے میں ایک آنہ ڈال دیا تھا۔ اس طرح ظہورن ساری برادری کی نظروں میں بھورے کی ہو گئی تھی اور جب ظہورن بارہ سال کی ہوئی تھی تو بھورے کو دیکھ دیکھ کر شرمانے لگی تھی۔ وہ اپنی بھیگتی ہوئی مسوں پر ہاتھ پھیر کر سخت احمقوں کی طرح

ہنستا تھا۔ پھر جب ظہورن چودہ پندرہ سال کی ہوگئی تھی تو اپنے ساتھ کھیلنے والی لڑکیوں سے پیغام بھجواتی تھی کہ ظہورن تیرا انتظار کر رہی ہے۔ ڈولا لے کر کب آئے گا۔ بھورے محنت مزدوری کر کر کے کوڑی کوڑی بچا رہا تھا کہ گھر آباد کرلے۔ خالہ کے لئے خدمت کرنے کو کوئی آ جائے اور پھر یہ کہ ظہورن اسے اچھی بھی لگنے لگی تھی۔ اسی زمانے میں ملک آزاد ہوگیا۔ بھورے لاکھوں کمانے کے لئے لاہور آگیا اور کئی سال دھکے کھانے کے بعد اسپتال میں نوکر ہوگیا۔ لاہور کی رنگین زندگی اور تنہا شخص۔ ظہورن تو خواب کی طرح یاد رہ گئی تھی، اور سیتاپور—— بھلا کیا رکھا تھا سیتاپور میں۔ سارا دن سڑکوں پر دھول اڑا کرتی۔ راہ گیر درختوں تلے گٹھڑیاں، سرہانے رکھ کر سوتے رہتے اور درختوں پر بیٹھے ہوئے بندر اس تاک میں دیدے گھماتے رہتے کہ کیا اچک لے جائیں۔ بابو لوگوں کے تھوڑے سے بنگلے، پرانی وضع کے دو چار مندر، لڑکیوں کا ایک کالج جہاں رات گئے تک کیرتن کی آواز آتی رہتی۔ بھلا کون یاد رکھتا اس سیتاپور کو؟

مگر اب جب کہ ظہورن اس کے سامنے کھڑی تھی تو اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ظہورن کسی دوسرے کی ہوگئی۔ وہ جسے بھورے کی خالہ نے ایک آنہ ٹھیکرے میں ڈال کر بھورے کے لئے خرید لیا تھا اور اب اس ایک آنے کے بدلے میں اس سے وفاداری نہ پا کر دکھ سے تلملا اٹھا تھا۔ اس اسپتال میں آنے کے بھلا کیا مطلب ہوتے ہیں۔ یہی نا کہ بچہ پیدا کرنا ہوتا ہے یا پھر کسی زنانے مرض کا علاج۔

"کیسے آنا ہوا اسپتال میں؟" بھورے نے تصدیق کرنی چاہی۔

مگر ظہورن کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے ساکت کھڑی رہی، پھر نظریں اٹھا کر اور بھورے کو بڑی دکھی دکھی نظروں سے دیکھ کر لان کی طرف دیکھنے لگی جہاں ایک پیاسی ٹیٹری شور مچاتی اڑی جا رہی تھی۔

"مینہ برسے گا ٹیٹری چہک رہی ہے۔" ظہورن نے دھیرے سے کہا۔

"ہوں!" بھورے کو اپنے دکھ میں اچانک کمی کا احساس ہونے لگا۔ کیا کہتی تھی خالہ ٹکے کی ہنڈیا گئی، کتے کی ذات پہچانی۔

"چاچا چاچی کہاں ہیں؟ سب کیسے ہیں؟" بھورے نے دنیا کی باتیں کرنی شروع کر دیں مگر ظہورن کی میلی میلی پیلی آنکھوں میں ایک دم آنسو آ گئے۔ وہ بھورے کے قدموں کے پاس پکے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ ایسی تھکی اور نڈھال نظر آ رہی تھی جیسے کوسوں دور سے چل کر آ رہی ہو' بھوکی پیاسی' پیروں میں چھالے — "اماں آتے ہی ہیضے میں مرگئی۔ دو سال ہوئے کہ بابو بھی ٹرک تلے آکر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس دوسرے بڑے اسپتال میں تین دن پڑا رہا تھا۔"

اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو خشک کر لیے۔

بھورے نے نظریں جھکا لیں۔ ظہورن کو اس حال میں دیکھ کر اسے بھی افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔ صدیاں گزر گئیں مگر ان دائمی جدائیوں کے دکھوں کو ہلکا کرنے کے لیے آج تک کوئی لفظ ایجاد نہ ہو سکا۔

زینوں پر لوہے کی ہیل کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ بھورے سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

مس رضیہ فون کرنے آ رہی تھیں۔ وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ظہورن سر جھکائے اسی طرح بیٹھی رہی۔

"کون ہے یہ؟" مس رضیہ نے رسیور اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے سیتا پور کی ہے مس صاحب۔" بھورے نے کہا۔ ظہورن نے نظریں جھکا لیں۔ "یہ سہر کی جندگی کچھ نہیں ہوتی' اپنے سیتا پور میں سارے لوگ جانتے تھے کہ بھورن بھورے کی کیا لگتی ہے۔" ظہورن نے ٹھنڈی سانس بھر کر سوچا۔

مس رضیہ فون کر کے چلی گئیں تو بھورے پھر بیٹھ گیا۔ اس نے ظہورن کی طرف دیکھا جو بڑی معصومیت سے چہرہ اٹھائے جانے کس طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے کہنے لگی — "جب سے کھالہ کے پاس تیرا کھط آیا تھا' بس اسی روج سے بابو سے کہنے لگی تھی کہ تو بھی لاہور چل۔ تیرے بنا سیتا پور جنگل لگتا تھا تو بہت یاد آتا تھا۔ اماں نے سادی کے جو کپڑے بنوائے تھے وہ اب تک کلیجے سے لگا کر رکھ چھوڑے ہیں۔ کبھی تن کو نہیں لگائے۔ بابو نے تجھے اس لاہور میں سب جگہ تلاش کیا پر تو نہ ملا۔ بڑے سہروں میں کتنا آدمی بستا ہے پر اماں کو اللہ

جنت دے کہا کرتی تھی کہ جی سے ڈھونڈو تو کھدا بھی مل جاتا ہے۔ سچ کہتی تھی اماں"——وہ مسکرانے لگی۔

"چھوڑو ان باتوں کو اب' پرائی ہو کر ایسی باتیں کیوں کرتی ہے؟" بھورے جھلا اٹھا۔ یہ عورت ذات بھی بڑی چترباز ہوتی ہے۔ اب نخرے کر رہی ہے۔

"یہ تو کہہ رہا ہے؟" ظہورن نے جانے کیسی سرشاری سے آنکھیں بند کرلیں۔ "میں تو جی جان سے تیری ہوں بھورے۔" وہ ساری جان سے کانپنے لگی۔ پہلے بیمار چہرے پر ہلکی سی سرخی رینگ گئی اور بھورے نے اپنے سیتاپور میں دیکھا کہ ایک چمپئی رنگ کی لڑکی' سرخ اوڑھنی اوڑھے کواڑوں کی اوٹ سے اس کو تاک رہی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے۔

اس نے پوری آنکھیں کھول کر ظہورن کو دیکھا۔ یہ جی جان کو لے کر کیا کرنا ہے۔ اب ایسی باتیں یاد کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ "تم اسپتال کیوں آئی ہو؟" اس نے پھر اچانک سوال کیا۔

ظہورن نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگی——"دیکھ اب تو بادل گھر کر آگئے ہیں۔"

"اصلی بات کیوں چھپاتی ہے' کہہ دے نا کہ جب میں نہیں ملا تو تیرے باپ نے دوسرے کو ہاتھ پکڑا دیا' ایکٹرسوں والے نخرے نہ مار اب۔" اسے غصہ آگیا تھا۔

"واہ رے"——اس نے غرور سے سر اونچا کر لیا——"جھورن ایسی نہیں کہ ایک کے بعد دوسرا کھسم کر لے۔ میری شادی تو تیرے ساتھ ہو چکی ہے۔ تیری کھاطر اپنا دیس چھوڑا' ماں باپ چھوٹے' ماں یہاں نہ آتی تو بیجہ کیوں ہوتا۔ بابو ٹرک تلے کیوں آتا"——وہ رو پڑی——"یہ سب تو جبردستی ہوتا ہے' بابو کے بعد کون دیتا روٹی' کوٹھیوں میں کام کر کے پیٹ بھرتی تھی' پر بھورے یہ سسری بابو بڑے کھراب ہوتے ہیں۔ ہر سال اس اسپتال میں آکر کچے بچے جنتی ہوں۔ مر مر کر جیتی ہوں۔ بابو صاحب اپنے کسی بیرے کھانسامے کو میرا سوہر لکھا جاتے ہیں۔ اس باری وہ کھانساماں کہتا تھا کہ جھورن ایسے کب تک چلے گا میرے ساتھ دو بول

پڑھا لے۔ تجھے لے کر دور بھاگ جاؤں گا۔ پر میں ایسا کر سکتی تھی؟"—— وہ سسکیاں بھرنے لگی اور پھر ڈوبتی ہوئی آواز میں بولنے لگی—— "اب تو مل گیا ہے بھورے' اب میں کہیں نہ جاؤں گی' دیکھ برتن مانجھ مانجھ کر ہاتھ گھس گئے۔" اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ اس کی ہتھیلیوں میں مشقت کے گھٹے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا سر گھٹنے پر ٹیک لیا اور گھٹی گھٹی سسکیاں بھرنے لگی۔

بھورے چپ چاپ بیٹھا اسے روتے دیکھتا رہا۔ جیسے وہ کوئی راہ چلتا اجنبی تھا۔ ساری لگاوٹ اور حسد رفو چکر ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس ظھورن سے اب اس کا کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ یہاں تو جانے کتنی اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔ اس کی کون سی خواہش ہے جو پوری نہیں ہو جاتی۔ اس نے تو یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی ایسی ویسی عورت اس کی بیوی بن جائے مگر اب یہ ظھورن جانے کتنے حرامی بچے جن کر اسے بیتی باتیں یاد دلانے آئی ہے۔

روتے روتے ظھورن نے خود ہی چپ ہو کر آنسو پونچھ لئے۔ شاید وہ انتظار کر رہی ہوگی کہ اب بھورے اسے چپ کرائے گا' اب اپنے ریشمیں رومال سے آنسو پونچھے گا' اب اسے تسلی دے گا۔

آنسو پونچھ کر وہ اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی اور بھورے اس سے نظریں بچا رہا تھا۔ بھلا ظھورن بھورے کی بیوی بن سکتی ہے! بھورے جس کی اس برآمدے اور ٹیلی فون پر حکمرانی ہے۔ ذرا کبھی ظھورن دیکھتی تو' کہ وہ کس شان سے رسیور اٹھا کر ہلو کہتا ہے اور کتنی لڑکیاں اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔

"تو پھر تو اسی خانساماں سے شادی کر لے ظھورن۔" بھورے نے بڑی ہمدردی سے مشورہ دیا۔ "میں نے تجھ سے شادی کی تو لوگ کیا کہیں گے۔" وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"ارے' یہ تو کہہ رہا ہے؟" اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھورے کو دیکھا اور پھر کھڑی ہو گئی۔ "جا رے' میرا نام بھورن ہے۔ میری سادی جو ہونی تھی سو ہو گئی۔ میں تیری جیسی نہیں ہوں۔ بادہ لے لے جو دوسری سادی کروں——" اس نے بڑے غرور سے سر جھٹکا۔ "بھورن جندگی بھر تیرے نام پر بیٹھی رہے گی

اور دوسروں کے بچے اسی اسپتال میں آکر پیدا کرے گی۔ یہ سب کسمت کے کھیل ہیں رے ——"

وہ ایک بار پھر تڑپ کر روئی مگر جلدی سے آنسو پونچھ کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس کا کمزور جسم کانپ رہا تھا۔ "اماں کو اللہ جنت نصیب کرے، کہتی تھی کہ بھورن ڈھونڈے سے تو کھدا بھی مل جاتا ہے۔ جانے لوگ ایسی کہاوتیں کیوں بناتے ہیں؟" اس نے مایوسی سے سر جھکا دیا۔ ایک لمحے تک یوں ہی کھڑی رہی۔ پھر اس نے بھورے کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اسے اپنا کلیجہ ہلتا ہوا محسوس ہونے لگا، مگر جب وہ کچھ کہنا چاہتا تھا تو ظہورن بڑی تیزی سے اپنے جھانکڑ جیسے جسم کو لہراتی برآمدے کے اس سرے پر جا چکی تھی۔

بھورے دیر تک برآمدے کے اس موڑ کو دیکھتا رہا جہاں ظہورن کھو گئی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو وہ جیسے چونک پڑا۔

"مس زیدی آج چھٹی پر ہیں جی، کہیں گئی ہیں، یہاں نہیں ہیں۔" بھورے نے پہلی بار اپنی ڈیوٹی سے بے ایمانی کی۔

پھر وہ ظہورن کو ٹھکرانے والا پہلا دن یوں ہی اچاٹ سا گزر گیا۔ وہ لاکھ گاتا رہا۔

نہ تم سے دل کو لگاتے، نہ غیر کہلاتے
گلوں میں بیٹھتے، گلزار کی ہوا کھاتے

پھر بھی اس کا دل بجھا بجھا رہا۔ شام ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہ جیسے خود بخود کھنچتا ہوا جنرل وارڈ کی طرف چلا گیا۔ آیا نے اسے بتایا کہ اس نام کی عورت تو گھنٹہ پہلے چھٹی لے کر چلی گئی۔

چلی گئی تو کیا ہوگیا؟ وہ بھلا اسے پوچھنے آیا ہی کیوں تھا؟ بھورے نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر واپس ہوتے ہوئے اس نے لہک کر گانا چاہا مگر گا نہ سکا۔ اس پر ایک دم مایوسی کا دورہ سا پڑنے لگا۔ ادھر ادھر پھرنے کے بجائے اپنی کوٹھری میں جا کر بے سدھ سا پڑا رہا۔

جب اندھیرا پڑنے لگا تو سیتاپور کی ظہورن سرخ اوڑھنی اوڑھ کر کوٹھری

کے ادھ کھلے دروازوں سے جھانک کرنے لگی۔ بھورے بلبلا کر اٹھا اور زنجیر چڑھا کر اپنے حساب ایک بار پھر ظہورن کو دھتکار دیا۔

باہر بڑے زور سے بارش ہو رہی تھی۔ کوئی ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ بھورے کو یہ بھی وہم لگا۔ اس نے اپنے آپ کو دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں اور کروٹ لے کر منہ چھپا لیا۔ وہ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ کئی دن پہلے اس نے جمادارنی کی سب سے چھوٹی ساتویں بیٹی کو اپنی کوٹھری میں آنے کی دعوت دی تھی اور اب وہ باہر کھڑی اپنے اکلوتے بوسیدہ جوڑے کو نچوڑ نچوڑ کر بیتابی سے دروازے پیٹ رہی تھی۔ ظالم بارش کا ایک ایک قطرہ روپے کی طرح کھنک کر اسے چڑا رہا تھا۔

بھیگتے بھیگتے تھک کر جب ساتویں بیٹی واپس لوٹ رہی تھی تو مارے دکھ کے رو رو کر بھورے کو کوس رہی تھی—— مرجائے' لاش اٹھے' ایک روپیہ دینے کا وعدہ کر کے مکر گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ پہلے دن اور پہلی رات والی کیفیت بھورے کے دل و دماغ پر نقش ہوتی چلی گئی۔ اس نے ظہورن کو جھنجلا جھنجلا کر لاکھوں بار دھتکارا۔ جمادارنی کی ساتویں بیٹی کو ایک کے بدلے میں تین روپے دے ڈالے۔ کالی لوکٹ نرس کی لونڈیا کو جمپر کا کپڑا بھی لا دیا۔ فرصت کے وقت خوب لہک لہک کر اپنے محبوب گانے بھی گاتا رہا مگر کہتے ہیں کہ پتھر کا لکھا ہوا نہیں مٹتا۔ ظہورن کی محبت پتھر کی تحریر بنتی گئی—— بھورے میں تیری ہوں' بادہ لے لے جو دوسری سادی کروں' تیرے نام پر بیٹھی رہوں گی اور دوسروں کے بچے اسی اسپتال میں آ کر پیدا کرتی رہوں گی——

پھر برسات بیت گئی۔ سردیاں آ کر گزر گئیں۔ بہار منہ موڑ گئی اور جب گرمیاں آ گئیں تو بھورے نے انگلیوں پر پورے نو مہینے گنے۔

اس دن جب گیٹ کے چوکیدار نے کسی حاملہ کی آمد پر گھنٹہ بجایا تو بھورے بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ برآمدے کے قریبی موڑ کو کاٹ کر وہ ادھر پہنچ گیا جہاں آیائیں پہیوں والے اسٹریچر کو گھسیٹتی ہوئی لاتیں اور مریضہ کو اس پر ڈال کر لے

جاتیں۔

دن میں کئی بار گھنٹہ بجتا۔ جانے کون کون آتا مگر ظہورن نہ آئی۔ بھورے نے سوچا ایسے کاموں میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔ واپس آکر وہ بڑی امنگ سے گاتا۔

بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر خالق نے گر ملا دیا

مئی جون کی گرمیاں گزر گئیں مگر بھورے کے انتظار میں فرق نہ آیا۔ مس لال خان اپنے عاشق سے بے وفائی کر کے، کسی دوسرے سے شادی رچا کر اسپتال چھوڑ گئی تھیں۔ مس زیدی کو دوسرے اسپتال میں زیادہ بہتر جگہ مل گئی تھی۔ بہت سی پرانی لڑکیاں چلی گئیں، بہت سی نئی آگئیں۔ جنرل وارڈ کی بھنگن کی سب سے چھوٹی ساتویں بیٹی جانے کس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ مگر بھورے کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہ تھا۔ اس نے جانے کتنی بہت سی چیزیں ظہورن کے لئے کوٹھری میں جمع کر رکھی تھیں۔ جن میں ایک سرخ جوڑا بھی تھا۔

آج بادل چھا رہے تھے۔ پیاسی ٹیٹری چیختی ہوئی اڑی جا رہی تھی۔ ظہورن دری کا ٹکڑا اٹھائے بھورے کے سامنے سے گزر کر ستون کے پاس جا رہی تھی۔ بھورے نے آنکھیں ملیں —— کب آئے گی ظہوریا؟ کب آئے گی؟ —— اس نے ایک بار پھر انگلیوں پر دن گنے۔ پورے بارہ مہینے ہو رہے تھے۔

بھلا بھورے کو کیسے معلوم ہوتا کہ ایک مہینے پہلے سرخ کھدر کی چادر سے منہ چھپائے جو عورت تانگے پر آئی تھی اور جسے آیاؤں نے بڑی مشکل سے لاد کر اسٹریچر پر ڈالا تھا، وہ ظہورن تھی، جس نے اپنا نام تمیزن لکھایا تھا اور جو خون کی انتہا کی کمی کی وجہ سے مر گئی تھی اور صاحب کا نامزد شوہر ظہورن کی لاش کو طالب علم لڑکیوں کے لئے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

پورے بارہ مہینے —— بھورے نے سوچا کہ اب وہ ضرور آتی ہوگی —— آج نہیں تو کل آجائے گی۔ اس نے بڑے سکون سے پاؤں پھیلا دیئے اور لہک کر گانے لگا:

بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر خالق نے گر ملا دیا ——!

# ثریّا

مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میری پرانی مہترانی کیوں چلی گئی اور اس کی جگہ نئی مہترانی کس طرح آئی- دوسری مہترانی کو دیکھ کر مجھے سخت اچنبھا ہوا کہ کیا وہ میرے گھر کا کام چھوڑ سکتی ہے جب کہ میں نے کبھی اسے کام کی خرابی پر ڈانٹا تک نہیں! بعد میں تفصیل معلوم ہوئی کہ خانساماں صاحب کی اس سے لڑائی ہوگئی اور انہوں نے اسے نکال دیا- خانساماں صاحب کو اس گھر میں جتنے اختیارات حاصل ہیں میں نے ان پر کبھی بھی مالکانہ چھاپہ مارنے کی کوشش نہیں کی- اسی لئے خون کا گھونٹ پی کر چپ ہو رہی- پہلی مہترانی ہمارے گھر میں چار سال سے کام کر رہی تھی اور بڑا ستھرا کام کرتی تھی- نئی مہترانی گیارہ بارہ سال کی پیاری سی صورت کی بچی تھی- پہلے دن وہ اپنی ماں کے ساتھ کام کرنے آئی تھی- اس کی ماں کو دیکھ کر یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ اس حقیر پیشے کے لئے پیدا ہوئی ہے- اس کے چہرے پر عجیب سا وقار تھا-

انہوں نے بڑی محنت سے کام کیا مگر مجھے یہ دیکھ کر غصہ آگیا کہ نہ تو انہیں فرش صاف کرنا آتا تھا اور نہ قالین پر برش پھیرنے کی تمیز تھی-

جب انہوں نے جانے کی اجازت مانگی تو میں نے انہیں پاس بلا کر ذرا غصے سے پوچھا "تم کب سے کام کر رہی ہو؟ اسی طرح صفائی ہوتی ہے؟"

ماں نے کوئی جواب نہ دیا- وہ ہونٹ بھینچے خاموش کھڑی رہی مگر اس کی لڑکی کی زبان قینچی کی طرح چل پڑی- "امی کو تو کوئی کام کرنا آتا ہی نہیں، بس گھر کا کام کرتی ہے- میں اور دادی کوٹھیوں کی صفائی کرتے ہیں- آج تو امی ساتھ تھی اس لئے کام خراب ہوگیا- کل سے آپ دیکھیے گا جی کہ میں کیسا کام کرتی ہوں-

سب کہتے ہیں کہ ثریا تو تو بڑی ہوشیار ہے۔ آپ کو خوش کر دوں گی۔" اس کے پھولے پھولے گال خوشی سے تمتما رہے تھے مگر اس کی ماں نے بیٹی کی باتوں پر ذرا بھی احتجاج نہ کیا اور خود کو نالائق تسلیم کرتے ہوئے اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ مجھے اس اتنی سی بچی کی ایسی پکی پکی باتوں پر ہنسی آ رہی تھی۔

دوسرے دن ثریا کام کرنے آئی تو اس طرح صفائی کی کہ سارے گھر کو چندن بنا دیا۔ میں حیران رہ گئی کہ ایک دن میں ایسا سلیقہ کس طرح آ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کل محض بدذاتی کی وجہ سے خراب کام کیا تھا۔ چلو اچھا ہوا کہ پہلی ہی جھڑکی سے عقل ٹھکانے آ گئی۔

کام ختم کرنے کے بعد ثریا نے مجھے بڑے فخر سے دیکھا۔ "ٹھیک ہے نا بی بی جی؟"

"شاباش۔" میں نے بھی اس کی ہمت بڑھائی۔ "تم نے بڑی اچھی صفائی کی ہے۔"

"سب کہتے ہیں ثریا تو تو بڑی ہوشیار ہے۔ میری دادی کو بھی ایسا کام نہیں آتا۔ پہلے پہلے تو وہ جس کوٹھی میں جاتی تھی، بس دو دن بعد نکال دی جاتی۔" اپنی تعریف سن کر وہ اس وقت بڑی مغرور نظر آ رہی تھی۔

"پہلے کیا کام کرتی تھی تمہاری دادی؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، گھر میں کام کرتی تھی۔ گھر کا کام بہت ہوتا ہے جی۔" جانے کیوں اس کا چہرہ کمھلا گیا۔

"تو کیا اب گھر کا کام ختم ہو گیا؟"

"نہیں بی بی جی۔" ذرا دیر کو چپ ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ "وہ جو ہماری برادری کے لوگ ہوتے ہیں نا، وہ باتیں کرتے تھے کہ گھروں میں بیٹھ کر شہزادیوں کی طرح روٹی کھاتی ہیں۔ اور بھی ایسی ویسی باتیں۔ اسی لئے میں اور دادی کام کرنے لگے۔ تیس روپے دادی کو مل جاتے ہیں، بیس روپے مجھے ملیں گے۔ اچھا ہی ہے نا بی بی جی، کچھ آئے گا، جائے گا تو نہیں!"

"بالکل ٹھیک ہے، کام کرنا تو بہت اچھی بات ہے۔" میں نے ثریا سے ایسی

دانائی کی باتیں سن کر اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

کتنی مہترانیاں آئیں اور چلی گئیں۔ ان کی عجیب عجیب عادتیں تھیں۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب وہ مانگنے کی عادت سے چوکتی ہوں۔ دوپٹہ، شلوار، ایک اٹھنی، تھوڑا سا گھی، آٹا اور جب کچھ نہ ملے تو روٹی کی فرمائش یقینی ہوتی۔ کچھ مل گیا تو واہ واہ، نہ ملے تو ٹکا سا جواب سن کر ڈھٹائی سے چلی گئیں، کسی ملال یا کھسیانے پن کے آثار نظر نہ آتے مگر ثریا جب سے آئی تھی، اس نے کبھی کچھ نہ مانگا۔ ایک آدھ بار ملازم نے اسے روٹی کھلانی چاہی تو اس نے صاف انکار کردیا۔ "اپنے گھر سے بڑا کچھ کھا کر آئی ہوں۔"

دسویں پندرھویں دن ثریا کی ماں یا دادی آجاتیں اور یہ پوچھ کر چلی جاتیں کہ وہ ٹھیک کام کرتی ہے یا نہیں، اور یہ کہ مجھے اس سے کوئی شکایت تو نہیں۔ میرے اطمینان دلانے اور ثریا کی تعریف کرنے سے وہ خوش ہو کر پلٹ جاتیں۔

ثریا کو کام کرتے ہوئے کئی مہینے ہوگئے، اب وہ مجھے ایسی اچھی لگنے لگی تھی کہ جب کبھی مجھے فرصت ہوتی تو اسے اپنے پاس بٹھالیتی اور باتیں کرنے لگتی۔ اس کی پکی پکی باتیں سن کر کبھی کبھی مجھے شبہ ہونے لگتا کہ یہ لڑکی گیارہ بارہ سال کے بجائے پچاس برس کی ہے۔ وہ اس طرح لئے دیئے رہتی کہ حیرت ہوتی۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے دنیا کو دیکھا ہے، برتا ہے اور بڑی تجربے کار ہے۔ جب مجھے اس کی باتوں پر ہنسی آتی تو وہ حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگتی۔ اس وقت وہ مجھے بالکل چھوٹی سی اور نری الو لگتی کیونکہ میری ہنسی کی وجہ اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ ایک بار میں نے اس کی باتوں اور کام سے خوش ہو کر اسے انعام میں ایک روپیہ دیا مگر اس نے روپے کو بری چیز کی طرح میز پر رکھ دیا۔ "بڑا کچھ ہے اپنے گھر میں بی بی جی۔ بس تنخواہ لوں گی اور کچھ نہیں چاہیے۔"

میں نے بہت اصرار کیا مگر اس نے روپے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ مجھے اس کی اس حرکت سے سخت ہتک کا احساس ہوا۔ بڑی لاٹ صاحب کی بچی بنتی ہے۔ میرا جی چاہا کہ دو تھپڑ لگاؤں کم بخت کے "کیا کیا ہے تیرے گھر میں جو اتنا بنتی ہے۔" میں نے غصے کو دبا کر پوچھا۔

"بڑا کچھ ہے بی بی جی! ایک بھینس ہے' پکا سات سیر دودھ صبح دیتی ہے' سات سیر شام۔ ایک ٹائم کا دودھ امی بازار میں دے دیتی ہے۔ دوسرے ٹائم کے دودھ سے گھی اور لسی بنالیتی ہے اور امی کے پاس ایک اتنا بڑا' آپ کے چھوٹے کمرے جتنا بکسا ہے' اس میں چھینٹ کے چھ نئے لحاف' چھ گدے اور دس کھیس بھرے ہیں۔ جب برادری والوں کے گھر بہت سے مہمان آجائیں تو وہ سارے ہمارے گھر سے لحاف گدے مانگ کر لے جاتے ہیں اور ہمارے گھر بہت سے برتن ہیں' ان پر پھول بنے ہیں' وہ امی نے پرچھتی پر سجا رکھے ہیں۔ اتنا بڑا شیشہ ہے۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر شیشے کی لمبائی بتائی۔ "اور ہماری امی کے پاس اس کی شادی کے پانچ جوڑے ہیں' سب میں گوٹا لگا ہوا ہے اور ——"

"اور وہ جوڑے تیری امی تیرے جہیز میں دے دے گی؟" میں نے اسے چھیڑا تو وہ ایسی شرمائی کہ سر نہوڑا کر بیٹھ گئی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میرا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا تھا اور میں ثریا کے گھر سے مرعوب ہو گئی تھی۔ اپنا تو یہ حال تھا کہ مدت ہوئی خالص دودھ کا ایک گھونٹ نصیب نہ ہوا۔ ڈالڈا کھا کھا کر جی اکتا گیا۔ خالص گھی کی خوشبو تک یاد نہیں۔ کبھی بھینس پالنے کا تصور تک نہ آیا صرف اس خوف سے کہ چھ سات مہینے تو دودھ گھی کھاؤ اور جب وہ گابھن ہو تو مفت میں کھلاؤ اور پھر اسی بازار کے دودھ اور ڈالڈا کو بھگتو۔

"اور بی بی جی ہمارے گھر مٹی کی اتنی بڑی کٹھالی ہے جس میں گیہوں بھرا رہتا ہے اور پچھلے سال تو امی نے کرسمس پر میرے لئے ایک گوٹے کا جوڑا بنوایا تھا۔ اب کے بھی اسی کو پہنوں گی۔ آپ کرسمس کو جانتی ہیں نا؟ یہ ہماری عید ہوتی ہے' جیسی آپ کی عید ہوتی ہے نا؟"

"مجھے پتہ ہے پگلی۔" میں ہنس پڑی' مگر جانے کیا بات تھی کہ کرسمس کا ذکر کرتے ہوئے اس کا منہ اتر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بجھ گئی تھیں اور نہ جانے وہ کس سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"کیوں ثریا رنجیدہ کیوں ہو گئیں؟" میں نے پیار سے پوچھا۔

"کچھ نہیں' اتنے دن بعد آئے گی ہماری عید۔"

"بس اتنی سی بات!" میں ہنس رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ لاکھ پکی پکی باتیں کرے مگر آخر تو بچہ ہے۔

دس بارہ دن سے میں بے حد مصروف تھی ویسے مصروف ہوتی کب نہیں۔ چھوٹے چھوٹے کتنے بہت سے کام ہوتے ہیں جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے۔ مگر ادھر تو اتنے مہمان آئے کہ مجھے سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ ثریا آتی، کام کرتی اور خاموشی سے چلی جاتی۔ اس سے جب تک خود بات نہ کرو تو کیا مجال ہے کہ وہ بول جائے۔ ان دنوں میں ایک بار اس کی دادی بھی آئی مگر مہمانوں کو دیکھ کر ثریا کے کام کے سلسلے میں کچھ پوچھے بغیر ہی چلی گئی۔

آج مجھے فرصت ملی تو سکون سے بیٹھنا نصیب ہوا اور اس وقت جب ثریا کام ختم کر کے جانے لگی تو میں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ بات کرنے کو جی تو نہ چاہ رہا تھا مگر باہر بڑے زور سے بادل گرج رہے تھے۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ غریب بارش میں نہ بھیگ جائے۔ میں نے اسے اتنے دن بعد جو قریب سے دیکھا تو وہ مجھے بے حد کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے رخسار بچپن کی تازگی کھو چکے تھے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ "اری ثریا تو اتنی دبلی کیوں ہو گئی؟" میں اس کے لئے واقعی فکرمند ہو گئی۔

"نہیں تو بی بی جی۔" وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر سہلانے لگی۔

"تیرے گھر میں تو بھینس ہے کیا تجھے پینے کو دودھ نہیں ملتا؟"

"امی تو اتنا کہتی ہے کہ پی، مگر مجھے دودھ سے الٹی آتی ہے۔"

اب مجھے یقین ہو گیا کہ ثریا ضرور بیمار ہے۔ اس کا اگر ابھی علاج ہو جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ ان لوگوں کی جہالت تو اس وقت بیماری کا احساس دلاتی ہے جب خدا کو پیارے ہونے کے قریب ہو جائیں۔ مجھے اس اتنی پیاری بچی پر سخت رحم آ رہا تھا۔ "چل تجھے میں ڈاکٹر کو دکھا لاؤں، اپنی امی کو بھی ساتھ لے لے۔"

"توبہ توبہ! میں کیوں جاؤں ڈاکٹر کے پاس، مجھے اس کے نام سے بھی ڈر آتا ہے۔ ٹیکہ لگا دیتے ہیں۔ میری چھوٹی بہن کو ٹیکہ لگایا تھا تو دو دن بعد مر گئی تھی، میری امی اب تک یاد کر کے روتی ہے۔" اس نے بڑے بوڑھوں کی طرح ٹھنڈی

سانس بھری۔

"تو پھر تو کچھ دن اپنے گھر آرام کر، اتنے دنوں کے لئے میں دوسرا انتظام کرلوں گی۔" میں نے مشورہ دیا، مگر ثریا کا پیلا چہرہ اور بھی پیلا ہوگیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی اور پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔ "آپ مجھے نکال رہی ہیں۔ مجھے تو آپ سے پیار ہے بی بی جی، میں اس گھر میں کسی کو کام کرنے نہ آنے دوں گی۔" اس نے ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہا اور پھر اپنا چہرہ اوڑھنی میں چھپا کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے بہت تھک گئی ہو۔

"اری پاگل تجھے کون نکال رہا ہے؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگی —— "بھلا میں اپنی ثریا کو نکال سکتی ہوں!"

وہ آنسو پونچھ کر مسکرانے لگی۔ آج پہلی بار وہ میرے بالکل قریب آگئی تھی۔ اس کے کپڑوں سے ایسی سخت بساند آرہی تھی کہ میں نے مشکل سے آتی ہوئی ابکائی کو روکا۔ میں نے تو کبھی یہ خیال ہی نہ کیا تھا کہ اس کے کپڑے اتنے غلیظ ہوتے ہیں اور یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ جب سے آئی ہے اس کے تن پر یہی جوڑا ہوتا ہے۔ "شاباش، روتے نہیں، اب بیٹھ جاؤ۔"

جب وہ بیٹھ گئی تو میں نے نصیحت کی کہ وہ روز نہایا کرے اور دوسرے تیسرے دن کپڑے بدلا کرے۔ گندے رہنے سے بھی صحت خراب ہوتی ہے۔

"گھر میں بڑے کپڑے ہیں بی بی جی، گھر جا کر یہ کپڑے اتار دیتی ہوں اور دوسرے پہن لیتی ہوں۔ یہ کپڑے تو گندا کام کرنے کے وقت پہنتی ہوں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔"

وہ ذرا دیر بیٹھی رہی اور پھر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں برابر سوچتی رہی کہ آخر میں نے ثریا کو ہٹانے کی بات ہی کیوں کی۔ اگر میں نے یہ بات نہ کی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ثریا کے آنسو سارا دن میرے لئے عذاب بنے رہے۔ بہرحال میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ کل جب وہ آئے گی تو اس سے خوب محبت سے باتیں کروں گی۔

دوسرے دن ثریا آئی اور جب کام ختم کرکے جانے لگی تو میں نے اسے بٹھا

لیا مگر ابھی کوئی بات نہ کرنے پائی تھی کہ اس کی دادی آگئی اور ثریا کے قریب بیٹھ گئی۔ "کام ٹھیک ہوتا ہے بی بی جی؟"

"بالکل ٹھیک، میں تو کہتی ہوں کہ ایسا کام اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔" ثریا کی تعریف کر کے میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے فخریہ انداز سے مسکرا رہی تھی۔

"اب تو جا نا!" ثریا نے اپنی دادی کو ٹھوکا دیا۔ "گھر میں کتنے بہت سے کام ہوتے ہیں، یہاں ایویں بیٹھی ہے!"

ثریا کی دادی جیسی بیٹھی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ وہ میری طرف ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آج کوئی ایسی بات تھی جسے میں کسی طرح بھی نہ سمجھ پا رہی تھی۔

"بی بی جی!" اس کی دادی نے مجھے ہولے سے پکارا۔

"کیا بات ہے؟"

"بی بی جی، ثریا کی تنخواہ سے پانچ روپے پیشگی دے دیں۔ کل سے گھر میں روٹی نہیں پکی، اب تو بھوکے پیٹ کام بھی نہیں ہوتا۔ ثریا کی ماں الگ۔۔۔۔!" وہ جانے اور کیا کہنے والی تھی، اس کی آواز میں کیسی التجا تھی مگر ثریا تو ایک دم بھپر کر اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنی دادی پر جھپٹ پڑی۔ وہ اپنی پوری طاقت سے دادی کو مار رہی تھی، نوچ رہی تھی اور ساتھ ساتھ چیختی جا رہی تھی ——"بے شرم نہیں تو۔ ابھی سے مانگنے لگی، صبر نہ آیا تجھے، تیرے کنبے نے بھی کبھی کسی سے کچھ مانگا تھا؟ اللہ کرے تو بھوکی مرے، تیری لاش اٹھے، اور تو۔۔۔"

میں نے کھینچ کر ثریا کو الگ کرنا چاہا مگر وہ نہ ہٹی۔ اس نے اپنی دادی کا منہ ناخنوں سے کھرچ کھرچ خون نکال دیا تھا۔ اس کی دادی کیسی خاموشی سے بیٹھی پٹ رہی تھی۔ اس نے ذرا سی مزاحمت نہ کی۔ بس اس کی میلی میلی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

جب میں نے ثریا کو کھینچ کر الگ کیا تو وہ منہ چھپا کر زور زور سے روتی ہوئی

باہر بھاگ گئی۔ میں حیران کھڑی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔

"آخر بات کیا ہے ثریا کی دادی؟"

کچھ نہیں بی بی جی۔ جب سے براوقت پڑا ہے تو چار چار فاقے کاٹے ہیں پر ثریا کی یہی ضد ہوتی ہے کہ کسی سے کچھ نہ مانگو چاہے مرجاؤ۔" وہ سسک کر روئی اور پھر اپنے چہرے پر سے خون پونچھنے لگی—— "بی بی جی ہم لوگوں نے کبھی یہ مہتروں والا کام نہیں کیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ اپنی بھینس تھی۔ اپنا گھر تھا۔ اپنی تھوڑی سی زمین بھی تھی، جس پر ثریا کا ابا لہسن، پیاز اور سبزیاں بوتا، پھر انہیں شہر لا کر بیچ دیتا۔ پیسے کی کمی نہ تھی۔ پھر زمینداروں کی زمینوں پر بھی کام کرتا تھا۔ سال تک کھانے کو کنک مل جاتی۔ لحاف گدوں سے بکسے بھرے پڑے تھے۔ ثریا کو اس کا ابا رانیوں کی طرح رکھتا تھا۔ پھر بی بی جی! راتوں رات پتہ چلا کہ لڑائی ہوگئی۔ ہندوستان کی فوجیں آگئیں۔ بس جو ایک ایک جوڑا کپڑا تن پر تھا۔ اسی حالت میں بھاگ کر لاہور آگئے۔ یہاں کب سے جھونپڑا ڈال کر پڑے ہیں۔ جب دوسری عورتوں نے بھوکے مرتے دیکھا تو اس کام پر لگا دیا۔ پر ثریا اب تک اپنے کو گاؤں والی ثریا جانتی ہے۔ چار دن بھوکی رہے تو کسی چیز کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ پر میں بوڑھی——" وہ پھر رونے لگی۔

میں دم بخود بیٹھی تھی۔ میری کچھ ایسی کیفیت ہو رہی تھی کہ نہ بولا جاتا نہ رویا جاتا۔ میرے دل میں بس دکھ کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ میں کیسی بیتاب تھی کہ ثریا کو اپنے کلیجے سے لگا لوں۔

میں بڑی مشکل سے اٹھی اور ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ اسے دے دی اور اپنی طرف سے بھی دس روپے دے دیے۔ "اس سے تم اپنے لئے آٹا خرید لینا۔"

وہ مجھے دعائیں دیتی اور چہرے سے خون صاف کرتی ہوئی چلی گئی۔

ثریا پھر کبھی میرے گھر نہیں آئی۔ میں کتنے دن تک اس کا انتظار کرتی رہی، اسے خوابوں میں دیکھتی رہی۔

فوجیں واپس چلی گئیں۔ بے گھروں کو اپنے اپنے گھروں میں جانے کی اجازت بھی مل گئی۔ میرے ہاں کئی مہترانیاں آئیں اور چلی گئیں، مگر آج بھی جب وہ کچھ مانگتی ہیں تو مجھے ثریا کی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ "اپنے گھر بڑا کچھ ہے بی بی جی!"

# سودا

جب وہ افسر بہادر کے گھر نوکری کے لئے بھیجا گیا تو اس پر عجیب سی وحشت طاری تھی۔ شانے جھکے ہوئے' رنگ پیلا' آنکھوں تلے اندھیرا۔ اتنی بڑی کوٹھری میں وہ یوں کھو گیا جیسے سچ مچ مر گیا ہو۔ یتیموں کی طرح کھڑا ٹکر ٹکر دوسرے نوکروں کا منہ تک رہا تھا اور وہ سب اس قدر مصروف تھے کہ کسی نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کس قدر فضول سی چیز سمجھ رہا تھا اپنے آپ کو۔ اس کا بس چلتا تو یہاں کبھی بھی نہ آتا مگر برا ہو ماں باپ کا جنھوں نے ساری برادری سے زور ڈلوا کر اسے بھجوا دیا۔ سب اس کے انکار پر حیران تھے۔ کسے ملتی ہے افسروں کے گھر نوکری۔ کم بخت ایسی خوش نصیبی پر لات مار رہا تھا۔ ماں باپ کا خوشی سے برا حال تھا۔ وہ گاؤں میں فخریہ سر اونچا کر کے یہ تو کہہ سکتے تھے کہ ان کا بیٹا سرکاری افسر کے گھر نوکر ہے۔ گاؤں والوں پر رعب پڑے گا۔ دشمن بھی دوستی کا دم بھرنے لگیں گے۔ ان کے گاؤں سے کئی آدمی سرکاری افسروں کے گھر نوکری کرنے گئے تھے ایسی شاندار تنخواہ کہ اپنے اپنے گھر بھر لئے تھے اور پھر کسی کی مجال تھی جو ان سے اونچی آواز میں بات بھی کر سکے' موچی' میراثی ہو کر ملک جی کہلوانے لگے تھے۔ چھٹی پر آتے تو لیڈی ہملٹن کی قمیص پہنے ہوتے۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ سخت ڈرا ہوا تھا۔ اگر افسر بہادر کے گھر ٹھیک سے کام نہ کر سکا تو جانے اس کا کیا حشر ہو۔ اسے بچپن ہی سے افسر کے نام سے ڈر لگتا تھا اس نے تو برادری کی بات بھی رد کر دی لیکن رانی نے عین وقت پر چپکے سے مل کر یہی مشورہ دیا کہ نوکری پر چلا جائے۔ اس کے بعد اس کے باپ کی مجال ہے جو رشتے سے انکار کر دے۔

سر جھکائے جوتوں پر نظریں گاڑے گاڑے جب کافی دیر ہو گئی تو آیا اسے

اپنے ساتھ بیگم کے کمرے میں لے گئی۔ سرخی پاؤڈر سے لپی پتی گڑیا جیسی بیگم کو اپنے بستر میں فوم کے گدے میں غوطے لگاتے دیکھ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ بھلا اس کا کیا قصور تھا۔ اسے تو آیا لے آئی تھی' اس نے پہلے دیکھ ہی لیا ہوتا کہ کہیں بیگم لیٹی تو نہیں۔

"تم کو کون سا کام کرنا آتا ہے؟" بیگم نے بڑے رعب سے سوال کیا اور ٹانگیں پھیلا کر چت لیٹ گئیں۔

"جو کہیں بی بی جی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے بیگم کی طرف دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔ اس طرح تو کبھی اس کے سامنے رانی بھی نہ لیٹی تھی۔ اگر یوں لیٹی ہوتی تو ـــــ تو ـــــ وہ گڑ بڑا گیا۔ سر توڑ دیتا اس کا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو۔ آیا' خانساماں اور مالی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرو گے۔" گڑیا کی آواز بڑی کرخت تھی۔

"بہت اچھا۔"

"تمہارا کام یہ ہے کہ رات کو صاحب کے اور بچوں کے جوتوں پر پالش کرو گے۔ بھینس کی دیکھ بھال کرو گے' میز پر کھانا لگاؤ گے' کھانے کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کرو گے اور کل صبح سے بازار سے سودا بھی لاؤ گے۔"

"جی بی بی جی۔" کام تو کچھ بھی نہیں۔ وہ جی ہی جی میں خوش ہو گیا۔

"تنخواہ پندرہ روپیہ مہینہ ملے گی۔ یہاں بہت خوش رہو گے۔ فکر نہ کرنا۔ ہاں!"

"جی ـــــ جی ـــــ" پندرہ روپے مہینے کی بات پر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سر پر لاٹھی کھینچ ماری ہو' پچیس تیس روپے اور سال کا اناج تو وہ محنت مزدوری کر کے کما لیتا تھا۔ اب اماں ابا کی طبیعت ٹھیک ہو گی۔ بھوکے مریں گے تو پھر برادری روٹی دینے نہ آجائے گی۔ جانے کون سے زمانے کے افسر ہوں گے جو نوکروں کو لمبی تنخواہیں دیتے تھے۔ ایسے گھروں میں نوکری کر کے چاندی ہو جاتی تھی۔ یہاں تو لوہے کے دام بھی نہ ملے۔ اس پر کچھ ایسی مایوسی طاری ہوئی کہ سر جھکائے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"سمجھ گئے!" بیگم نے اسے یوں کھڑا دیکھ کر سختی سے کہا۔ "کوئی گڑبڑ میں پسند نہیں کرتی۔"

"جی بی بی جی۔" وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گڑبڑ کرنے کی اس میں کب ہمت تھی۔ ایسی ہمت کرنے والوں کا انجام دیکھ چکا تھا۔ ایک نوکر کے اس نے خود اپنی آنکھوں سے ہتھکڑی لگے دیکھا تھا ہتھکڑی کے تصور ہی سے اس پر ایک بار لرزہ طاری ہوگیا۔

"جاؤ' اب خانساماں سے کھانا مانگ لو۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔" اس بار بیگم کی آواز میں بڑی نرمی تھی۔ کمرے سے وہ یوں نکلا جیسے واقعی قید سے آزاد ہوگیا ہو۔

باورچی خانے میں جا کر وہ بڑی خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ آیا' مالی اور خانساماں بان سے بنی ہوئی پرانی پیڑھیوں پر بیٹھے' اپنے اپنے حصے کا کھانا کھا رہے تھے اور دونوں ادھیڑ عمر کی آیا سے ہلکے ہلکے فحش مذاق کرتے جا رہے تھے۔ آیا کا میاں جوانی میں مرگیا تھا۔ اس نے دوسری شادی نہ کی اور یہی حسرت اس کی آنکھوں سے جھانکتی رہتی۔ ایسی ویسی باتیں سن کر ذرا جی شاد کرلیا کرتی۔ ویسے تو بیگم ایسی سخت تھیں کہ مجال ہے کوئی اپنی من مانی کرسکے۔ وہ چپ چاپ کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا اور جی ہی جی میں کڑھ بھی رہا تھا۔ لالچ کیسی بری چیز ہے۔ ماں باپ اپنی اولاد کو بھی داؤں پر لگا دیتے ہیں۔ جانے یہاں سے کب جان چھوٹے گی۔

"اٹھا پلیٹ" تھوڑی دیر بعد خانساماں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "کیا نام ہے تیرا؟"

"صابر" اس نے الماری سے پلیٹ اٹھالی۔

"ابے یہ پلیٹ نہیں چلے گی' یہ مالکوں کے برتن ہیں۔ نوکروں کے برتن ادھر پھٹے پر رکھے ہیں۔" خانساماں نے انگلی سے اشارہ کیا۔

صابر نے دوسری پلیٹ اٹھالی۔ اسے یہ سب کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ نوکر مرد نہیں ہوتا' بیگمیں ٹانگیں پھیلائے لیٹی رہتی ہیں۔ کتوں کی طرح نوکر کے برتن الگ ہوتے ہیں۔

"بیگم نے تیرے ذمے کون کون سے کام لگائے ہیں؟" خانساماں نے سالن نکالتے ہوئے پوچھا۔

"رات کو جوتوں پر پالش کرنا' بھینس کی خدمت' کھانے کے کمرے کی صفائی اور سودا لانا۔"

"سودا؟" خانساماں کی مونچھیں ایک دم کھڑی ہو گئیں۔ "کیسا سودا؟" ابھی آیا اور ابھی سودا لائے گا؟ میری باری ختم نہیں ہوئی اور تو سودا لائے گا؟ ابے کیا گھانس کھا لیا ہے؟ مجھے جانتا نہیں؟"

"میرا کیا قصور؟" وہ بڑی مسکینی سے بولا۔ "بیگم نے کہا ہے کہ میں کل سے سودا بھی لاؤں گا۔"

"میرا کیا قصور" خانساماں نے اس کی نقل کی۔ "یاد رکھیو' میرا نام دلاور ہے۔ بڑا خراب آدمی ہوں۔" اس نے دو موٹی موٹی روٹیاں اور سالن کی پلیٹ اس طرح آگے بڑھائی جیسے کھینچ کر مار رہا ہو۔ صابر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"خانساماں جی مجھ سے کیوں ناراض ہوتے ہو۔"

"دیکھو کیسا شریف نظر آ رہا ہے جیسے کچھ جانتا ہی نہیں۔" آنسو دیکھ کر خانساماں کو اور بھی غصہ آ گیا۔

"رہنے بھی دے دلاور' نیا نیا ہے' ابھی اس کو کیا پتہ' پھر جو کچھ تو کہے گا وہی کرے گا۔"

"ہاں ہاں بڑا معصوم ہے' اسے کیا پتہ' جب دونوں ہاتھوں سے جیبیں بھرے گا تو پھر پتہ چلے گا۔ ہتھکڑی لگوا دوں گا بیٹا کے۔"

"بس کر دلاور' تیرے کہے پر نہ چلے تو پھر بات کیجیو۔" آیا بڑی مکاری سے باتیں کر رہی تھی مگر صابر کو وہ بڑی اچھی لگی۔

"خانساماں سودا تو لے آیا کرنا' میں تیرے حصے کا کام کر دوں گا' میں تو تیرا بھائی ہوں۔"

"توبہ کر' تیری باری پر میں سودا لا سکتا ہوں؟ بیگم بڑی ویسی ہے۔ ہر طرف سونگھتی پھرتی ہے۔ دکانوں سے پچھوا لیتی ہے۔ کوئی بہانہ نہ چلے گا۔" خانساماں اب

ذرا نرم پڑ گیا تھا۔

"پھر میں کیا کروں؟"

"بے شک سودا لینے جا مگر میں جو کچھ کہوں گا وہی کرنا' میری بات نہ مانی تو یاد رکھیو میں سات سال پرانا کام کرنے والا ہوں۔ میرا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ انگریزی اور اردو دونوں کھانے پکا لیتا ہوں۔ اس سے پہلے انگریزوں کی نوکری کرتا تھا۔ ہاں گڑ بڑ کی تو تجھے پار لگا دوں گا۔" خانساماں ایک آنکھ پچکا کر زور سے ہنسا۔ اس وقت وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ بیگم اس کا بے تحاشہ بڑھا ہوا تن و توش دیکھ کر روٹھی روٹھی رہتی تھیں۔ کئی بار جھاڑ بھی چکی تھیں۔ اشاروں اشاروں میں تنبیہہ بھی کی تھی کہ اپنی کھال کے اندر رہے اور اب جیسے ہی نیا نوکر آیا تو خانساماں کی لگام کھینچ دی۔ ارے ہاں کیا پتہ کہ کہیں ہاتھ سے نکل جائے۔ ایسا اچھا کھانا پکانے والا کہاں مل سکتا تھا۔ پھر آخر دوسرے نوکروں کو بھی تو جینا تھا۔

"دیکھ بیٹا' سودے سے جو کچھ بچے گا۔ اس میں ایک حصہ میرا بھی ہوگا۔ سمجھ گیا؟ تجھ سے پہلے جو نوکر تھا' اسے یوں چٹکی بجاتے میں نے اڑایا ہے' مجھے الو بنانے لگا تھا۔" خانساماں نے مونچھ کا کونا مروڑ کر اور اونچا کر دیا۔

حصے کی بات سن کر صابر سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے گا۔ کل کو بیگم نے جیل بھجوا دیا تو خانساماں حصہ بٹانے تو نہ آجائے گا۔

"خانساماں جی' میں سودے سے ایک پیسہ نہ کاٹوں گا' پندرہ روپیہ مہینہ ملے گا وہی ٹھیک ہے' بے شک ماں باپ بھوکے مر جائیں۔ کہیں کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو؟"

"ابے کیوں مرا جاتا ہے۔ بازار گیا تو چاند کی سیر کر آئے گا۔" خانساماں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "بس یہ بتا دینا کہ کس گھر سے آیا ہے۔ سمجھا؟" خانساماں نے بڑی شفقت سے صابر کی کمر پر ایک دھول رسید کر دی۔ "لے اب کھا خوب ڈٹ کر' مہینے تک سودا لایا تو ان سوکھی ہوئی ہڈیوں پر اصلی گھی کی چکنائی چڑھ جائے گی۔"

بیگم کے پکارنے کی آواز آئی تو صابر دوڑتا ہوا کمرے میں پہنچ گیا۔ "بھینس کو پانی پلا دینا' اور دیکھو سب نوکروں سے کہہ دو کہ اب میں سو رہی ہوں' آیا سے کہو کہ بچوں کے کمرے میں جائے' دوپہر میں کوئی باہر نہ نکلے۔"

"بہت اچھا بی بی جی۔"

بھینس کو پانی پلاتے ہوئے اسے برابر رانی یاد آتی رہی۔ گوری چٹی رانی' جب سیاہ چمکتی ہوئی بھینس کو ساتھ لے کر چرانے جاتی تو اور بھی گوری نظر آتی۔ کتنی بار اس کا جی چاہا تھا کہ اللہ اسے بھی بھینس بنا دے۔ کم از کم رانی کے ساتھ تو رہ سکے گا۔ مگر اب تو رانی نے اسے الو بنا کر یہاں بھیج دیا تھا۔

"لالچی' کتے کی اولاد——" وہ رانی کو یاد کر کے گالیاں دیتا رہا۔

بھینس کو پانی پلانے کے بعد' خانساماں سے پوچھ کر اس نے کھاٹ اٹھائی اور لان کے ایک سرے پر گھنے درخت کے سائے میں بچھا کر لیٹ گیا۔ ایسی گرم گرم ہوا چل رہی تھی کہ جسم جھلسا جاتا۔ ذرا دیر بعد خانساماں اور مالی بھی آ گئے۔

"لے بیٹا اٹھ جا' دنیا ہی میں جنت کے میوے کھا لے۔" خانساماں نے ایسے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا کہ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ خانساماں نے بغل میں دبی ہوئی پوٹلی نکال کر کھاٹ پر رکھ دی۔ پھر بڑے فخر سے گرہ کھولی۔ پیلے پیلے پکے ہوئے بڑے بڑے آٹھ آم سامنے پڑے تھے۔ ایسے آم تو صابر نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھے تھے۔ فصل پر کبھی کبھی آم بیچنے والا ادھر اس کے گاؤں میں بھی آ نکلتا۔ آم جن میں رس برائے نام ہوتا۔ "لے کھا" دو آم اس نے صابر کی طرف بڑھا دیے اور دو مالی کو دے دیے۔ اور چار آم ایسی تیزی سے چیر پھاڑ کر کھا گیا کہ صابر منہ تکتا رہ گیا۔ "ابے کھا تو منہ کیوں تک رہا ہے؟ یہاں ان چیزوں کی کمی نہیں۔ اتنی ہوتی ہیں کہ آدمی کھائے نہ تھکے۔ ہمارے صاحب کسی سے اور کچھ نہیں لیتے۔ بڑے ایماندار مشہور ہیں۔ اب اگر کوئی پھل فروٹ کے ٹوکرے لے آئے تو ہاتھ بھی نہیں پکڑے لیتے۔ باپ دادا کی طرف سے بیس پچیس مربعے ملے ہیں' کس چیز کی کمی ہے جو بے ایمانی کریں؟"

"بیگم سے پوچھ کر لائے ہو خانساماں؟" صابر نے پوچھا۔ اسے تو قدم قدم پر

جیل نظر آ رہی تھی۔ کہیں خانساماں اسے بھی نہ لے ڈوبے۔

"ابے الو کی کان، میں یہاں تیرے باپ کے سمان ہوں، جو کہوں وہ کر، پوچھ کر بھی کچھ ملا ہے۔ بیگم ہاتھ اٹھا کر کسی کو کچھ نہیں دیتی، ہم لوگ اپنا حصہ خود لے لیتے ہیں۔ بیگم کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ حساب کر کر کے مرجائے جب بھی اسے پتہ نہ چلے۔ یہاں ایسی چیزیں بے حساب آتی ہیں۔ تو خواہ مخواہ ڈرا جاتا ہے۔"

"نیا ہے نا، تھوڑے دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔" مالی نے آم رومال میں باندھ لئے اور باہر سے پھاٹک بھیڑ کر چلا گیا۔

ڈر کے باوجود چوری کے آم بڑے میٹھے تھے۔ خانساماں اگر اپنے آم منٹوں میں چٹ نہ کر جاتا تو شاید اس سے ایک آم کی فرمائش اور کر دیتا۔

دوسرے دن بیگم نے اسے دس کا نوٹ پکڑا دیا —— "ایک مرغی، آدھا سیر بکری کا گوشت، آدھا سیر ٹماٹر، دو کھیرے، آدھا سیر پیاز۔ نوکروں کے لئے آدھا سیر گائے کا گوشت۔"

"بس بی بی جی؟"

"ہاں بس، خانساماں کو میرے پاس بھیجو اور تم مالی کے ساتھ بازار ہو آؤ۔"

خانساماں کو بیگم کے پاس بھیج کر صابر مالی کے ساتھ بازار چلا گیا —— کوئی بہت بڑا بازار تو تھا نہیں، تھوڑی دیر میں ساری دکانیں دیکھ لیں۔ مالی نے چائے والی کی دکان سے باسی پیسٹریاں کھائیں اور چائے کی پیالی پی کر چلتا بنا۔۔ مگر صابر اپنی آؤ بھگت دیکھ کر چکرایا جا رہا تھا۔ ہر سودے کے دام آدھے سے بھی کم تھے۔ سبزی والے نے دام لینے سے بالکل ہی انکار کر دیا۔ سب اس کے سامنے یوں بچھے جاتے جیسے وہ کہیں کا حاکم ہو۔ اسے اپنی اہمیت کا اس قدر سخت احساس ہو رہا تھا کہ پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔ اس کے تو چھوٹے بھائی نے بھی کبھی اس کی عزت نہ کی تھی۔ گاؤں والے الگ تو تکار پر اترے رہتے۔ باپ بھی صبح ہوتے ہی اسے کسی نہ کسی بات پر ایک آدھ گالی ضرور ٹکا دیتا۔

قصائی مدارات میں سب سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے اپنی پسندیدہ دکان سے صابر کے لئے چائے منگوائی۔ جس دکان سے مالی نے چائے پی تھی اس کی برائی

کی-- پھر دبی دبی زبان سے یہ بھی بتایا کہ مالی اور خانساماں اسی دکان سے چائے پیتے ہیں' اس کے آڑے وقت کام آتے ہیں- اس کے دوست کی دکان کا رخ نہیں کرتے- بڑے چالاک ہیں دونوں- اس کا دشمن چائے والا ایسا بدذات ہے کہ ٹھاٹ سے لکڑیاں جلاتا ہے- دھویں کے مارے سب کی آنکھیں پھوٹتی ہیں- پھر ایسی گندی چائے بناتا ہے' کیا مقابلہ کرے گا میرے یار کی چائے سے- تم کو وہاں کا حلوہ پوری کھلاؤں گا- بڑی مشہور ہے- خانساماں نے دس بار کہا کہ اس کم بخت کو بیگم صاحب کی طرف سے دھمکی دے دو مگر کون سنتا ہے-

قصائی کے اخلاق میں کچھ ایسی چھری جیسی تیزی تھی کہ صابر اس کی ہر بات مانتا گیا اور گھر واپس جاتے جاتے چائے والے کو لکڑی جلانے سے منع کرنے پہنچ گیا- مالی نے اس سے صابر کو ملوایا نہ تھا' اس لئے وہ ایک دم بپھر گیا لیکن جیسے ہی صابر نے افسر کے گھر اور بیگم کی دھونس جمائی تو "سم سم کھل جا" کا اثر ہوا- چائے والا خوشامدوں پر اتر آیا-

"ارے میرے بھائی یہاں تو خانساماں' مالی اور تجھ سے پہلے جتنے نوکر آئے سب چائے پیتے تھے- پہلے کبھی بیگم صاحب نے ایسا حکم نہ دیا- یہ سب قصائی کی شرارت ہے- غریب بندہ ہوں' لکڑی تو مفت میں کاٹ لاتا تھا- اب کوئلہ خریدنا پڑے گا- تمہاری ہر طرح خدمت کروں گا-"

"کچھ دن کوئلہ جلاؤ' پھر لکڑی جلانے کی اجازت دلوا دوں گا-" صابر نے بڑے غرور سے کہا مگر دل میں خانساماں سے ڈر رہا تھا- اسے پتہ چلا تو ناراض نہ ہو-

سودا لے کر کوٹھی پہنچا تو خانساماں اس کا انتظار ہی کر رہا تھا- اسے دیکھتے ہی آنکھ ماری- صابر اس مری ہوئی آنکھ کا مطلب تو سمجھ گیا مگر وہ ایمان داری سے بیگم کو حساب دینے کے لئے جا رہا تھا- خانساماں نے طیش میں آکر اسے پیڑھی پر دھکا دے کر بٹھا دیا-

"ابے الو کی کان- یہاں ایسی ایمانداری نہیں چلے گی- بیگم کو پتہ چلا کہ تو ان کے نام پر سستا سودا لاتا ہے تو سر توڑ دیں گی' جیل پہنچا دیں گی- نکال جیب

سے کتنا بچا لایا ہے۔"

صابر نے ڈر کر جیب سے پانچ روپے نکال دیئے۔ "بس اتنا بچا ہے۔"

"پانچ روپے؟ بس ٹھیک ہے۔ بیگم کو بتا دیجیو' مرغی ساڑھے پانچ روپے کی' گوشت ڈھائی روپے کا' سبزی ایک روپے کی' گائے کا گوشت آٹھ آنے کا۔ بیگم کی اٹھنی بچی۔ ڈیڑھ روپیہ میرا تین روپے تیرے۔ اپنے ڈیڑھ روپے سے چونی آیا کو دے دوں گا۔" بیچاری بیوہ ہے۔ اسے دینا ثواب کا کام ہے۔ پان تمباکو کھا لیا کرتی ہے۔"

صابر تین روپے جیب میں ڈال کر بیٹھا تو حساب لگانے لگا کہ مہینے میں کتنے روپے بنیں گے۔ نوے روپے کے خیال ہی سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے ساتھ بیگم کے خوف کی تلوار زور زور سے گردن پر وار کرنے لگی۔

خانساماں نے اسے یوں ڈرا سہا' چپ چاپ بیٹھے دیکھا تو سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ "ابے تو کیوں ڈرتا ہے۔ میرے ہوتے تجھے کس بات کی فکر۔ لے ایک گلاس دودھ پی لے' آخر تو بھینس کی رکھوالی بھی تو کرتا ہی ہے۔" خانساماں نے پتیلی سے گرم گرم دودھ انڈیل کر گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "بس ایک بات کا خیال رکھیو بیگم کو کسی بات کی خبر نہ لگے اور میرے حصے کی بات تو اسے کبھی نہ معلوم ہو۔ گھر کی بات باہر بھی نہ کہیو ہاں۔"

صابر دودھ پیتے ہوئے ہر بات پر اچھا اچھا کرتا رہا۔ خانساماں کے تسلی دینے سے اس کی ڈھارس بندھ گئی تھی۔ خانساماں تو سستا سودا لاتا ہے' بیگم کو اس بات کی خبر نہیں تو پھر وہ ناحق ڈرا جاتا ہے۔

کچھ دن تو ڈرتے ڈرتے گزرے پھر ہمت بڑھ گئی۔ سودا لاتے مہینہ گزرا تو صابر سو روپے کما چکا تھا۔ اس نے تو کبھی خواب میں نہ سوچا تھا کہ وہ سو روپیہ مہینہ کما سکے گا۔ اس کے جسم میں جیسے بجلیاں سی مچلنے لگی تھیں۔ یوں دوڑ دوڑ کر کام کرتا۔ بیگم کے منہ سے بھی تعریف نکل ہی جاتی۔ کبھی کبھی اسے دیکھ کر لاڈ سے مسکرا بھی دیتیں۔ اس وقت صابر مارے غرور کے چاند پر ہو بھی آتا۔ لیکن خانساماں کمبخت سے کد بڑھتا جا رہا تھا۔ مفت میں اس کے حصے کا ڈیڑھ روپیہ ہضم کر جاتا۔

دکاندار اس سے بیزار تھے۔ انہوں نے صابر کو بتایا تھا کہ کبھی کبھی خانساماں قرض سودا لے جاتا ہے اور پھر پلٹ کر ایک آنہ نہیں دیتا۔ سخت اتنا کہ ذرا تو تڑپڑ کرو تو جان کو آ جاتا ہے۔ بس اتنی اچھائی ہے کہ ہر ایک کے برے وقت میں کام آتا ہے۔ کیسا ہی کام ہو منٹوں میں کرا دیتا ہے۔ صابر سے سب خوش تھے نہ تو اس نے کبھی قرض سودا لے کر پورے دام ڈب میں کئے اور نہ کبھی کسی پر سختی کی۔ آدھے پونے دام ضرور دے کر ہی آتا۔ چائے والے کو لکڑی جلانے سے منع کرنے پر قصائی ایسا خوش ہوا تھا کہ اس نے صابر کے لئے لیڈی ہملٹن کی ایک قمیص بنوا دی تھی۔ خانساماں کو قمیص کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ چھپا کر لایا اور بکس میں بند کر دی۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ قمیص شادی میں پہنے گا۔ رانی نے کیسی دانائی کی جو اسے یہاں بھجوا دیا تھا۔ اب تو اس نے رانی کے نام کی ساری گالیاں واپس لے لی تھیں۔

سو روپے گھر منی آرڈر کرنے کے بعد صابر نے دھیرے دھیرے خانساماں کی طرف سے ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا۔ "آج تو صرف چار روپے بچے ہیں تو ایک روپیہ لے لے۔" خانساماں نے پہلے تو اسے بے تحاشا گھورا پھر ایک دم بھڑک گیا ——"ابے الو کی کان ہم سے اونچا اڑتا ہے؟"

"میں کیا کروں دکان والے زیادہ سستا سودا نہیں دیتے۔" صابر ڈھٹائی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیتا۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ خانساماں بیگم سے شکایت نہیں کر سکتا۔ شیشے کے گھر میں بیٹھ کر کون پتھر مار سکتا ہے۔ خانساماں نے دانت کٹکٹا کر روپیہ ہی جیب میں ڈال لیا۔ "دیکھوں گا تجھے بیٹا۔" وہ دھمکاتا تو صابر کو دل ہی دل میں ہنسی آتی۔ "میں تو سچ کہتا ہوں، تو یوں ہی غصہ کرتا ہے۔ دکاندار اب دھونس میں نہیں آتے۔ تم سے تو ڈرتے ہیں۔"

"جب میں سودا لاؤں گا تو پھر تیرا سارا جھوٹ کھل جائے گا۔ دکاندار دھونس میں نہیں آتے۔ ہنھ، سارے کے سارے بندھ جائیں گے، جو ہم سے اونچے اڑیں۔ سمجھ گیا۔ سب بے ایمان ہیں سالے۔"

"ہوں گے، مجھے کیا۔" صابر اور بھی معصوم بنتا تو خانساماں کو چپ ہونے

کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ انتقاماً" سب سے برا کھانا دیتا۔ سالن میں کچا پانی انڈیل دیتا۔ روٹیاں ایسی کچی کہ کھا کر بدہضمی ہو جائے یا پھر ہیضہ ہو جائے۔ یا پھر مر جائے۔ صابر نہ مرا نہ بیمار پڑا۔ وہ تو کنکر، پتھر بھی ہضم کر جاتا ان دنوں۔ آج کل تو ایف اے۔ بی اے روزگار کی تلاش میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں، وہ جاہل ہو کر سو روپیہ مہینہ کما رہا تھا۔ ادھر بیگم اس سے اتنی خوش تھیں کہ خانساماں اسے کھلے خزانے نقصان بھی نہ پہنچا سکتا تھا۔ کڑھ کڑھ کر وقت گزار رہا تھا اور صابر اسے کڑھا کر اپنی ہوشیاری پر نازاں تھا۔

بیگم صابر سے زیادہ خوش ہوئیں تو انہوں نے اسٹور کی چابی اس کے سپرد کردی۔ اب وہ کم بخت ناپ تول کر گھی، چاول، سویاں وغیرہ نکالا کرتا۔ پہلے یہ کام آیا کرتی تھی اور گھی نکالتے وقت خانساماں کی خستہ روٹیوں کا لحاظ رکھتی تھی۔ اب سوکھی روٹی کھاتے ہوئے وہ صابر کو دل سے بددعائیں دیتا۔

مرغی والا مری ہوئی مرغی ذبح کر کے بیچنے کے جرم میں پکڑا گیا۔ مرغی والے کو چھڑانا صابر کے حد اختیار سے باہر تھا۔ موقعہ تاک کر اس نے ڈرتے ڈرتے بیگم سے ذکر کردیا اور گواہی بھی دے دی کہ وہ مرغی زندہ تھی۔ یوں ہی آنکھیں موند کر پڑ گئی تھی۔ اس کے سامنے ذبح کی گئی تھی۔ لوگوں نے یوں ہی شور مچا دیا۔

بیگم نے سب سن کر غور سے صابر کی طرف دیکھا تو اس کی جان سن سے ہو گئی۔ پھر وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اب تو بڑا ہوشیار ہو گیا ہے۔ جھوٹ بھی بولنے لگا ہے۔"

"قسم لے لیجیے بی بی جی جو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" صابر کی جان میں جان آئی تو وہ ہمک کر بولا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غریب بال بچوں والا ہے۔"

"اچھا اب باتیں نہ بنا میں کہلا دوں گی، مگر اپنے مرغی والے کو سمجھا دیجیو کہ اب ایسی حرکت نہ کرے۔ غضب خدا کا مسلمانوں کو حرام گوشت کھلاتا ہے۔"

صابر کا مارے خوشی کے برا حال ہو گیا۔ اس نے خانساماں کو سارا قصہ سنا کر دھونس جمانا چاہی تو وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا —— "بیٹا اس سات سال میں

بیگم سے سات ہزار کام کرا چکا ہوں۔ تو ایک کام لے کر اتھلا ہو رہا ہے۔ تو اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔ خواہ مخواہ زیادہ سر نہ چڑھ' اتار کے پھینک دوں گا۔"

وہ تو دیکھا جائے گا۔ صابر نے دل ہی دل میں سوچا۔

مرغی والے کی پکڑ دھکڑ سے جان بچی تو اس نے صابر سے پندرہ دن تک مرغی کا ایک پیسہ نہ لیا۔ اس نے کئی بار کہا بھی کہ کیوں اپنا نقصان کرتا ہے' مگر مرغی والے نے ایک بات نہ سنی۔ صابر نے پندرہ دن کے اندر ہی اندر ساٹھ روپے کا منی آرڈر گھر بھجوا دیا۔ قصائی سے خط بھی لکھوا دیا کہ رانی کا رشتہ مانگ لو۔ اگر نہ مانیں تو ان سے کہو کہ گاؤں میں رہنا مشکل کر دوں گا۔

خانساماں مرغی والے کی رہائی کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ وہ روز صابر سے لڑتا کہ اس کا بھی حصہ لگائے مگر صابر ایسا معصوم بن جاتا جیسے کچھ جانتا ہی نہیں۔ تھک ہار کر خانساماں خوشامد پر اتر آیا۔ "دیکھ صابر بال بچوں والا ہوں' اب تجھے کیا بتاؤں' زبان سے نہیں نکال سکتا۔ دو بیویاں ہیں' نو بچے۔ جانے کم بخت وہ عیسنی کہاں سے آ گئی تھی میرے گلے پڑنے۔ جوانی کا نشہ تھا جو اس سے بھی نکاح کر بیٹھا۔ روپے روز میں کیا گزارا ہو گا۔ تجھ سے پہلے جو نوکر آئے وہ سب آدھا آدھا کرتے تھے۔"

"وہ کوئی اور الو کی کان ہوں گے دلاور' میرا نام صابر ہے۔" وہ دل ہی دل میں سوچ کر خوش ہوتا۔ اب کیسی خوشامد پر اتر آیا ہے۔ کیسا جھوٹا ہے۔ پکا مکان بنوا لیا ہو گا۔ سات سال سے کام کر رہا ہے۔ "کیا کروں خانساماں' دکاندار اب پہلے جیسا نہیں رہا۔" صابر بڑی معصومیت سے خانساماں کو یقین دلاتا۔ ایسی شکست تو خانساماں کو کبھی بھی نہ ہوئی تھی۔ آیا' مالی اور دوسرے کام کرنے والے سبھی اس کے حکم پر ناچتے تھے۔ اب کل کے چھوکرے نے اسے نچا مارا ہے۔ بیگم کے ڈر سے کچھ نہ کر پاتا۔ مارے غم کے اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ گیا۔ اس نے سوچا' ذرا بیگم کو پتہ بھی تو چلے۔ دو چار دن کھانا نہ ملا تو طبیعت صاف ہو جائے گی۔ پکوائیں۔ اپنے صابر سے۔

صابر ایسا چالاک کہ خانساماں کے لیٹتے ہی فٹافٹ کھانا پکانے لگا۔ خانساماں کو

پکاتے دیکھ کر تھوڑا بہت سیکھ گیا تھا۔ پھر بھی وہ بات کہاں' اس کے باوجود بیگم نے دو چار لقمے کھا کر تعریف کر دی۔

"اگر خانساماں مر جائے تو تو اچھا پکا لے گا۔" بیگم نے ہنس کر کہا اور صابر نے ممنونیت سے دانت نکال دیے۔ اسے احساس تھا کہ بیگم سے کھایا نہیں گیا۔ آٹھ دس دن خانساماں یوں ہی پڑا رہے تو اس سے زیادہ اچھا نہ پکا لے تو جب کی بات۔

شام کو بیگم صاحبہ نے خانساماں کو اپنے کمرے میں طلب کیا اور جب وہ آیا تو رنگ پیلا ہونے کے باوجود مرض دور ہو گیا تھا۔ کھاٹ کھڑی کر کے جی جان سے مرغی پکانے لگا۔

دوسرے دن اس نے صابر سے روپیہ بھی نہ مانگا اور بڑے پیار سے بولا تو صابر کی مارے حیرت کے بری حالت ہو گئی۔ صابر نے روپیہ دیا تو غصہ سے ڈانٹنے لگا' "ابے رکھ اپنے پاس' اتنا بھی خیال نہیں کہ اب تیری منگنی ہو چکی ہے۔ شادی کے لئے جمع کراؤ بھئی ضرورت پڑے تو مجھ سے لے لیجیو' تو کوئی غیر ہے۔"

صابر نے زبردستی روپیہ اس کی جیب میں ڈال دیا۔ اس دن سے لڑائی جھگڑا ختم ہو گیا۔ خانساماں اس سے اپنی اولاد کی طرح سلوک کرتا۔

ایک دن خانساماں نے اسے مشورہ دیا کہ بیگم خوش ہیں تو لگے ہاتھوں تنخواہ بڑھوا لے۔ دلاور کو تو تنخواہ کا کبھی خیال ہی نہ آیا تھا۔ نہ اس نے تنخواہ مانگی۔

"یار میں تو نہ کہوں گا' کیا رکھا ہے تنخواہ میں؟"

"واہ کیوں نہیں رکھا ہے' مجھ سے تو بیگم صاحبہ جب بھی خوش ہوتی تھیں دو تین روپے بڑھوا لیتا تھا۔ بیس روپے مہینہ تو کرا ہی لے' پانچ مہینے کے پکے سو بن جایا کریں گے۔ تو تو بچہ ہے۔ تجھے ابھی پیسے کی پروا نہیں ہوتی' مجھے تو تیری فکر کھائے لیتی ہے۔"

سو روپے کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ اس نے سوچا کہ ضرور کہہ دے گا۔ شادی میں جاتے جاتے ڈیڑھ سو تو بن جائیں گے۔ برادری کو کھلانے کے لئے دام نکل آئیں گے۔ زردے کی دیگیں چڑھوائے گا۔

رات کو صابر کھانا کھلا رہا تھا اور موقعہ کی تلاش میں تھا کہ بیگم نے خود ہی ایسی بات چھیڑ دی۔ "آیا کہتی تھی تیری منگنی ہو گئی ہے؟"

"جی بی بی جی——" صابر نے نظریں جھکا دیں—— عید کی دس تاریخ کو شادی ہو گی۔"

"پھر تو تو بڑا خوش ہو گا——" انہوں نے صابر کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھا۔ "چھٹی آٹھ دن سے زیادہ کی نہ ملے گی۔"

"اسے بھی لے آؤں گا' آپ کی خدمت کرے گی۔ تنخواہ تھوڑی ہے بی بی جی' شادی کے بعد گزارہ کیسے ہو گا۔"

"ہوں!" بیگم نے ایسی لمبی کرخت ہوں کی کہ صابر کا گلا تک خشک ہو گیا۔ "تنخواہ کم ہے' گزارہ کیسے ہو گا۔" انہوں نے صابر کو کھا جانے والی نظروں سے اس طرح گھورا کہ سارا جسم زیر و زبر ہو کر رہ گیا۔ وہ کرسی چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

برتن اٹھانے جب وہ باورچی خانے میں پہنچا تو خانساماں چہرہ دیکھتے ہی تاڑ گیا۔ "کہہ آیا تنخواہ کے لئے' کتنے روپے بڑھائے؟"

صابر کا بس چلتا تو خانساماں کی بوٹیاں نوچ ڈالتا۔ "ابھی میں نے بات نہیں کی۔" وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ بھلا وہ کیوں بتاتا کہ اس کی کیا گت بنی۔ دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ بیگم زیادہ ناراض نہ ہو۔ اس کی اور اس کے باپ دادا کی توبہ جو اب کبھی تنخواہ بڑھانے کی بات کرے۔ وہ تو چھٹیوں سے پہلے تنخواہ بھی نہ مانگے گا' چاہے اس کی اماں زیادہ روپوں کی فرمائش کر کر کے مر جائے۔

خانساماں اس کے صاف جھوٹ کو تاڑ گیا۔ "تو بات کرے یا نہ کرے' میں پینتیس روپے پر آیا تھا' بڑھوا بڑھوا کر ساٹھ روپے کر لئے۔"

"کر لئے ہوں گے' مجھے تو کہتے شرم آتی ہے۔ وہ مالک ہیں' جب دل چاہے گا تو خود ہی تنخواہ بڑھا دیں گی۔" صابر نے ایسی ہماہمی سے کہا کہ خانساماں بھی چکمے میں آ گیا۔

"مت کر بات' میرا کیا بگڑتا ہے' تیری فکر ہوتی ہے تو کہہ دیتا ہوں۔ اپنی

مرضی کا مالک ہے تُو تو۔"

دوسرے دن بیگم نے سودے پر خانساماں کی ڈیوٹی لگا دی۔ مہینہ ختم ہونے میں ہفتہ باقی تھا۔ صابر کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ بیگم کی ناراضگی آخر رنگ لا کر رہی۔ خانساماں بے حد خوش تھا۔ بازار جاتے جاتے صابر کا کلیجہ نوچ گیا۔ "بیٹا تونے اچھا ہی کیا جو تنخواہ بڑھانے کی بات نہیں کی۔ ٹھیک ہے نا؟"

صابر نے کوئی جواب نہ دیا۔ جھاڑن اٹھا کر کمرہ صاف کرنے چلا گیا۔ "کوئی بات نہیں، اسے خدمت کرنی آتی ہے۔ بیگم کو راضی کر لے گا۔"

خانساماں سودا لے کر آیا تو صابر نے ڈیڑھ روپے کا مطالبہ کر دیا۔ وہ بھی تو بیس پچیس دن ڈیڑھ روپیہ روز دیتا رہا تھا۔ صابر کے مطالبے پر خانساماں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "ابے مجھ سے مانگتا ہے۔ اب تک تیرے جیسے بہت آئے، سب نے حصہ دیا ہے، لیا کسی نے نہیں۔"

"وہ کوئی اور ہوں گے جو تیری خوشامد کرتے ہوں گے۔" صابر بھی اکڑ گیا۔

"بیگم سے شکایت کر دی تو اندر کرا دیں گی، میرے سر نہ چڑھ۔" خانساماں نے مونچھیں اچکائیں۔

"چل چار چھ آنے تو بھی دے دیا کر دلاور، کیوں جھگڑتا ہے، بیگم کو پتہ چلا تو غریب کو نکال دیں گی۔ تجھے پتہ ہے وہ لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتیں۔" آیا نے بڑی مکاری سے صلح کرانی چاہی۔

"میں لڑ رہا ہوں کہ یہ خواہ مخواہ فساد کرتا ہے۔" خانساماں اور بھی بپھرا۔ "میں تو یہی چاہتا ہوں کہ بیگم تک بات نہ پہنچے۔"

"جا جا، بیگم سے سو بار کہہ دے۔ نوکری جائے گی تو سب کی جائے گی۔ میں انہیں بتا دوں گا کہ اس نے مجھے یہ کام سکھایا تھا اور پھر حصہ لگاتا تھا۔ مفت کے روپے تجھے ہضم نہ ہونے دوں گا۔"

وہ بھی جانتا تھا کہ بیگم کے پاس شکایت لے کر کوئی نہ جا سکے گا۔ خانساماں ایک دم زچ ہو گیا۔ صابر تو ٹیڑھی کھیر تھا۔ ذرا رعب نہ پڑا۔ اسے تو اس خیال ہی سے خوف آتا کہ بیگم کو حصے بخرے والی بات معلوم ہو۔ وہ تو ایسی اصول کی پکی کہ

ذرا سی گڑبڑ برداشت نہ کرے۔

"بس بیٹا۔ تیرا سارا پتہ چل گیا۔ میں تو تجھے آزما رہا تھا کہ دیکھیں مجھے باپ سمجھتا بھی ہے کہ نہیں یہ لے ڈیڑھ روپیہ اور بھی جتنے روپوں کی ضرورت ہو لے لے، تیری شادی پر میری پائی پائی کام آجائے تو میں خوش ہوں گا۔"

صابر نے کچھ نہ کہا مگر ڈیڑھ روپیہ جیب میں ڈال لیا۔ ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھا کہ باتوں میں آکر واپس کر دیتا۔

بیگم نے کئی ہفتے صابر سے بات بھی نہ کی۔ آخر بیگم کو چپ توڑنا پڑی۔ ایسی محبت سے کام کرتا کہ ان کا دل بھی پسیج ہی گیا۔ آہستہ آہستہ وہ پھر خوش ہو گئیں، مگر جیسے ہی خانساماں کی باری ختم ہوئی تو ہفتے کے لئے مالی کی ڈیوٹی لگ گئی۔ مالی کو دوسرے تیسرے مہینے صرف ہفتے کی ڈیوٹی ملتی۔ ویسے بھی وہ رات دن کام کرنے والا نہ تھا۔ دو چار گھنٹے باغیچے کو سنوارتا اور پھر دوسری کوٹھیوں میں چلا جاتا۔ اب صابر بے چینی سے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ مالی سے تو لین دین بھی نہ تھا۔ پورا ہفتہ سوکھا ہی گزر گیا۔ شادی کے دن قریب آرہے تھے۔ ماں ہر خط میں بڑی فراخ دلی سے چیزوں کی فرمائش کرتی رہتی، وہ بھی بس یہ سمجھ رہی تھی کہ بیٹا ہنڈی پر بیٹھا ہے۔

ہفتہ ختم ہوا تو سودے پر صابر کی ڈیوٹی لگا دی گئی مگر بیگم کا دل ابھی اس کی طرف سے شاید پوری طرف صاف نہ ہوا تھا۔ پہلے ہی کہہ دیا کہ ایک مہینے تک تو سودا لائے گا۔ دوسرے مہینے خانساماں۔ اس نے سوچا چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ راضی تو ہوئیں۔ اس مہینے رانی کے سب کپڑے بنوا لے گا۔ سنار کا کام کرانے کے بدلے میں اسے ایک ننھا سا سونے کا ٹیکہ اور پیروں کے لئے چاندی کی پائل مل گئی تھی۔ ان چیزوں کو اس نے ایسے خاموشی سے چھپا رکھا تھا کہ کسی کو ہوا تک نہ لگنے دی۔

دکانداروں نے اس بار صابر کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ خانساماں کی ہزاروں شکائتیں کیں۔ صابر نے بھی ان کے ساتھ مل کر اچھی طرح دل کی بھڑاس نکالی۔ انہیں بھڑکایا بھی کہ اب وہ حرام زادہ آئے تو مفت میں نہ کھلاؤ پلاؤ۔ اس کی فوں فاں سے مت ڈرو۔

اس بار صابر نے خانساماں کو حصہ دینے سے صاف انکار کردیا۔ خانساماں نے بہت سمجھایا، خوشامدیں کیں، مگر صابر کا دل نہ پسیجا۔ بس آپا کو دونی دے دیا کرتا۔ وہ بھی خانساماں کی آنکھ بچا کر لیا کرتی۔

صابر جب سودا لاتا تو خانساماں اسے حیرت سے دیکھتا۔ "کتنا کما لایا ہے ماں کے لال؟"

"بس یہی پانچ چھ روپے ہوں گے۔" اسے جلانے کے لئے صابر چار کے چھ کردیا کرتا ـــــ خانساماں کو اس کی ذات سے نفرت ہو جاتی۔ منہ پھیر کر سودا اٹھا لیتا اور دل ہی دل میں صابر کو گھنی گھنی گالیاں دیتا۔ یہ کم بخت تو اس کے لئے عذاب بن گیا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ خانساماں ہو کر وہ صرف ایک مہینے سودا لائے۔ اس کا بس چلتا تو اسے کہیں جیتا جیتا گاڑ آتا۔ کیسے بدذات آدمی سے پالا پڑ گیا تھا۔ کچھ کرتے نہ بن پڑتی۔

رمضان کے مہینے میں خانساماں کی ڈیوٹی لگ گئی تھی۔ صابر اس بار بہت للچایا۔ رمضان کے مہینے میں سودا بھی بہت آتا اور روپے بھی دس کے بارہ ہو گئے تھے۔ مگر اب تو اس کی باری بھی نہیں آنی تھی جو کمانا تھا سو کما لیا۔ عید کی چار تاریخ کو چھٹی پر جانا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ چار پانچ دن سے زیادہ گاؤں نہ ٹھہرے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خانساماں اس کے خلاف بیگم کو بھڑکائے۔ اسے تو اس کی صورت سے ایسی نفرت ہوئی تھی کہ دیکھ کر جوڑی چڑھتی مگر خانساماں جانے کس ہڈی کا بنا ہوا تھا۔ رمضان شروع ہوتے ہی صابر سے بولنے چالنے لگا۔ رات کو اسے ایک گلاس دودھ بھی دے دیا کرتا۔ "لے پی لے نہیں تو سارا دن پیاس لگے گی۔"

صابر چپکے سے گلاس غٹا لیتا۔ اب تو وہ خود بھی اس سے لڑنا نہ چاہتا تھا۔ وہ چھٹی پر جا رہا ہے۔ کیا فائدہ کہ پیٹھ پیچھے اس کا برا چاہے، اس وقت تو بنا کر رکھنی چاہیے۔ جب چھٹی سے واپس آئے گا تو پھر ساری کسر نکال لے گا۔

چار تاریخ کو صابر کی ایک ہفتے کی چھٹی منظور ہو گئی۔ سامان باندھ کر تیار ہونے لگا تو خانساماں منہ بسورنے لگا اور پھر آنکھوں پر انگوچھا رکھ کر رونے لگا۔

"تیرے بغیر جی نہ لگے گا بیٹا۔ جلدی آجائیو۔"

صابر اپنے سلوک پر شرمندہ ہوگیا اور خانساماں کی محبت پر جی جان سے ایمان لے آیا۔ "بس چار دن میں آجاؤں گا خانساماں، میرا کہاسنا معاف کرنا، اب ہمیشہ تیری خدمت کروں گا۔" صابر بھی رنجیدہ ہوگیا۔

"تنخواہ لے لی؟" خانساماں نے آنسو پونچھ کر پوچھا۔ اگر زیادہ روپوں کی ضرورت ہو تو کچھ مجھ سے بھی لے لے خوب دھوم سے شادی کیجیو۔"

"ابھی تو نہیں مانگی، جاتے وقت بیگم آپ ہی دے دیں گی۔ مجھے مانگتے ہوئے برا لگتا ہے۔"

"لے تو بھی حد کرتا ہے، بڑے آدمیوں کو ایسی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں۔ چلتے وقت یاد دلا دیجیو۔ اور دیکھ جلدی آجائیو، میں اکیلے میں گھبراؤں گا۔"

دوپہر کو جب وہ جانے لگا تو بیگم کو سلام کرنے گیا۔ اور پھر نظریں جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

"جاؤ ہفتے کے بعد ضرور آجانا۔"

"اس سے بھی پہلے آجاؤں گا بی بی جی۔"

"ٹھیک ہے۔" بیگم نے خوش ہو کر کہا۔ "اب جاؤ ٹھاٹ سے شادی کرو۔" بیگم نے ہنس کر اسے دیکھا۔

"اور بی بی جی تنخواہ——؟"

"تنخواہ——؟" لیٹی ہوئی بیگم اس طرح بلبلا کر اٹھ گئیں جیسے بستر میں بچھو آگیا ہو۔

"حرامزادہ۔" پھر وہ زور سے چیخیں۔ "خانساماں"۔ خانساماں ایسی جلدی سے آگیا جیسے کہیں پاس ہی کھڑا ہو۔ "تم نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا؟ پہلے تنخواہ بڑھانے کی بات کی تو میں نے معاف کردیا تھا اور اب——" مارے غصے کے وہ سرخ بھبھوکا ہو رہی تھیں۔

"سب بتا دیا تھا، بی بی جی شریر آدمی ہے، کہتا تھا کہ محنت کرتا ہوں تو تنخواہ بھی لوں گا۔" خانساماں بڑا مسکین نظر آرہا تھا۔

"لے جاؤ اس پاجی کو' خبردار جو اب یہاں آیا' شادی کرنے جا رہا ہے ورنہ کہیں کا کہیں بھجوا دیتی حرام خور کو۔"

خانساماں نے صابر کو شانے سے پکڑ کر کھینچا۔ اس پر تو جیسے غشی سی طاری تھی۔ آنکھوں تلے ایسا گہرا اندھیرا کہ کچھ بجھائی نہ دیتا۔ خانساماں اسے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ "بیٹا ہم سے اڑتے تھے۔ اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ مل گئی تنخواہ؟ ہم نے سات سال میں کبھی تنخواہ نہیں مانگی' اب دوڑ جا سالے ہم سے بنا کر رکھتا تو سب سمجھا دیتے' اب دفع ہو۔" اس نے صابر کو باورچی خانے سے دھکا دے کر نکال دیا اور اتنے زور زور سے قہقہہ لگانے لگا کہ بھاگتے ہوئے صابر کو محسوس ہوا جیسے بہت سے بھوت اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ وہ تو مارے خوف کے اپنا بکس اٹھانا بھی بھول گیا تھا۔

# سہرا

کل ساجد میاں کا نکاح تھا مگر خوشی کے بجائے ان کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ اپنی دونوں بہنوں سے بار بار کہہ رہے تھے۔ "اے بڑی بجیا آپ اچھی طرح سن لیں میرا بستر ہمیشہ کی طرح اماں بی کے کمرے میں بچھا رہے گا۔ اسے کوئی نہیں ہٹائے گا اور آپ بھی سن لیں چھوٹی بجیا۔ اب آپ میرا بستر اٹھوانے کی بات نہیں کریں گی' کیا سمجھیں آپ؟"

"تو کیا تم اب بھی دودھ کی بوتل نہیں بھولے؟" چھوٹی بجیا کی کترنی جیسی زبان چلتی اور وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگتیں۔ اور ساجد میاں دانت پیس کر رہ جاتے۔ گھر میں ایسی دھما چوکڑی مچی تھی کہ کوئی کسی کی بات نہ سمجھ رہا تھا نہ سن رہا تھا۔ رشتے ناطے کی بھاوجوں اور خاندان کی ڈھیروں لڑکیوں کا جمگھٹ ڈھول پیٹ پیٹ کر گائے چلے جا رہا تھا۔ "پڑھ کے الحمد جو چہرے پہ سجایا سہرا ——"

اپنا سہرا سن سن کر بھی ساجد میاں کی آنکھوں کی وحشت کم نہ ہوئی۔ ایسا لگتا کہ سہرا گلاب کے پھولوں کے بجائے کانٹوں سے گوندھا گیا ہے اور وہ کانٹے ان کی آنکھوں میں چبھ رہے ہیں۔ موٹی موٹی بادامی پتلیوں والی بے چین آنکھیں گھوم پھر کر اپنی اماں بی کو دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ تھکی ہوئی' نڈھال' لُٹا لُٹا سا چہرہ' پیروں پر لحاف ڈالے اپنے بستر پر بیٹھی تھیں مگر جب لڑکیاں لہک کر گاتیں۔ "دوڑ کر سہرے کی اماں نے بلائیں لے لیں' ارے اماں نے بلائیں لے لیں ——" تو ان کے بچے کھچے ہلتے ہوئے دانت سہرے کی لڑی کی طرح ہونٹوں پر بکھر جاتے۔

"میں کتنی بار کہوں کہ اب آپ تھک گئی ہیں' ذرا دیر کو سو جایئے۔ میں بھی لیٹا جاتا ہوں۔" ساجد میاں اپنے بستر پر بیٹھ کر جوتوں کی ڈوریاں کھولنے لگے۔

"لو بھلا' میں کیسے سو جاؤں' ابھی تو بہت سے کام پڑے ہیں چھوہاروں کے تھال پوشوں پر گوٹا ٹانکنا ہے۔ سہرے اور پھولوں کے زیور کا آرڈر دلوانا ہے۔ سہرا گھٹنوں سے نیچا نہ ہو' لڑکیاں تو بس گانے بجانے میں جتی ہوئی ہیں۔"

اب بھلا اماں بی سے کون کہتا کہ جس طرح تمام کام ان کی دونوں بیٹیوں نے اپنی مرضی سے کر لئے تھے' اسی طرح رات کو گانے بجاتے تھال پوشوں پر سنہری گوٹے کے بجائے روپہلی گوٹا ٹانک دیا تھا۔ سہرے کا آرڈر بھی دیا جا چکا تھا۔ ایسا سہرا جو قدموں کو چھوئے۔ اماں بی کی اس بات کو کون مانتا تھا کہ پھول پیروں تلے آئیں تو پھولوں کی بے حرمتی ہوتی ہے۔

"سب کام ہو جائیں گے اماں بی۔ آپ پہلے ہی حکم دے چکی ہیں۔ دن کے دو بج رہے ہیں' اب آپ ذرا دیر آرام کیجئے' اے بڑی بجیا۔" انہوں نے زور سے آواز دی۔ "اے بڑی بجیا۔ کوئی نہیں سنتا۔ اے چھوٹی بجیا۔ خدا کے واسطے تھوڑی دیر کے لئے ڈھول اٹھا دیجئے۔ اماں بی کو سو جانے دیجیے۔"

"کوئی نہیں سوئے گا' ڈھول نہیں اٹھے گی۔" چھوٹی بجیا نے چیخ کر جواب دیا۔ اب ساری آوازوں میں ان کی آواز سب سے اونچی تھی——"دوڑ کر اماں نے سہرے کی بلائیں لے لیں۔ ارے بہنوں نے بلائیں لے لیں۔ پڑھ کے الحمد جو چہرے پہ سجایا سہرا——"

"مت روکو بیٹے—— گانے دو۔ یہ میری آخری خوشی ہے' نیند کا کیا ہے جب فرصت ملے گی سو جاؤں گی۔" اماں بی نے بڑی محبت سے ساجد کو دیکھا اور پھر بستر پر لیٹ کر پاؤں پھیلا دیئے۔ ساجد میاں جھپٹ کر اٹھے اور کمرے کے سب دروازے بند کر دیئے۔ اب آوازیں جیسے کہیں دور سے آ رہی تھیں۔

"بس اب آپ سو جائیں۔" ساجد نے اماں بی کی طرف سے کروٹ لے لی۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اماں بی اگر دوپہر کو نہ سوئیں تو ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ڈسپنسری سے ایک ڈیڑھ بجے ضرور گھر آ جاتے۔ انہیں یہ بھی پتا تھا کہ جب تک وہ خود بھی اپنے بستر پر نہیں لیٹیں گے اماں بی کو نیند نہیں آئے گی۔

جنریشن گیپ کے اس شدت پسند زمانے میں بہت سے لوگ ساجد میاں کو حیرت سے دیکھتے۔ شاید انہیں مہذب ملکوں کے وہ بوڑھے یاد آجاتے ہوں گے جو چھترے سفید بالوں والے سروں پر پرانی وضع کے ہیٹ رکھے راہوں میں پڑی ہوئی بنچوں پر پہروں بیٹھے رہتے ہیں۔ ترستی ہوئی نگاہوں سے دنیا کی ہماہمی کو دیکھتے ہیں۔ پھر جانے ان کے جی میں کیا خیال آتا ہے کہ ہیٹ آنکھوں پر کھینچ کر اونگھنے لگتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ تم اتنی دیر سے یہاں کیوں بیٹھے ہو اور اب تم اپنے ہیٹوں کی دنیا میں چھپ کر کون سے خواب دیکھ رہے ہو۔

"ساجد"——اماں نے ہولے سے پکارا

"جی اماں بی۔" ساجد میاں نے اماں بی کی طرف کروٹ بدل لی۔

میں سوچ رہی ہوں کہ اب تمہارا پلنگ یہاں سے اٹھوا کر اسٹور میں رکھوا دوں؟ اب اس کی یہاں کیا ضرورت رہ گئی ہے۔"

اماں بی اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"چھوٹی بجیا نے بھی یہی کچھ کہا تھا۔ بڑی بجیا نے بھی یہی فرمایا تھا اور میں نے ان دونوں سے کہا تھا کہ یہ پلنگ بچھا رہے گا۔ آپ بھی سن لیں اس پلنگ کو یہاں سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔" ساجد کی آواز میں بے حد دکھ تھا۔

"ارے پگلے یہ بستر تو تیری ذات سے سجا ہوا تھا' تیری وجہ سے میں اکیلی نہیں تھی۔ رات سوتے سوتے کسی وقت آنکھ کھل جاتی تو——" ان کی آواز بھرا گئی۔

یہ بستر اسی طرح سجا رہے گا اماں' میں کہاں جا رہا ہوں بھلا؟ آپ ایسی باتیں مت سوچیے۔

ساجد میاں نے اماں بی کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ گردن تک لحاف اوڑھا اور پھر تکیے کے نیچے رکھے ہوئے ململ کے سفید جھاگ جیسے دوپٹے کو چہرے پر ڈال لیا۔ یہ ان کے سونے کا اعلان تھا۔

ساجد جب چھوٹے سے تھے تو برسات کے موسم میں مکھیوں کے گچھے ان کے منھ پر آ آ کر بیٹھتے تو اماں بی پریشان ہو کر اپنے سر سے ململ کا دوپٹہ اتار کر ان

کا چہرہ ڈھانک دیا کرتیں۔ مگر اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بھی ان کی یہ عادت نہ چھوٹی۔ اماں کا دوپٹہ آنکھوں پر ڈالے بغیر انہیں نیند نہ آتی۔

منہ چھپا کر وہ تو اپنے حساب سوتے بن گیں مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ اماں بی مارے حیرت کے آنکھیں پھاڑے انہیں کس طرح دیکھ رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے کمرے کی ہر چیز گھوم رہی تھی۔ دل پر عجیب سا ہول طاری تھا۔ انہوں نے اٹھ کر ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا تو دروازے تک پہنچنے کا راستہ نہ مل رہا تھا۔ جیسے بھول بھلیاں میں پھنس گئی ہوں۔ اتنی بڑی بات سننے کے لئے بھی تو ہمت چاہیے۔ وہ ہڑبڑا کر ساجد میاں کے پلنگ سے ٹکرائیں۔

کیا ہے اماں بی؟ وہ جیسے کود کر کھڑے ہو گئے اور ڈولتی ہوئی اماں بی کو اپنے بازوؤں میں تھام کر بستر پر بٹھا دیا۔

"یہ آپ کدھر جا رہی تھیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ سو جایئے۔"

"نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سوچا لڑکیوں کے پاس جا بیٹھوں مگر بیٹے تم تو میرا سایہ بن گئے ہو۔"

"بس اب آپ نہیں اٹھیں گی۔" ساجد میاں نے اماں کو لٹا کر لحاف اوڑھا دیا اور انہوں نے بھی ساجد کو دکھانے کے لئے جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر لیں مگر نیند خاک آتی۔ وہ یکساں سوچے جا رہی تھیں۔ لو بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا بستر پہلے کی طرح کیسے سجا رہ سکتا ہے۔ اتنی بڑی بات اس نے کہی کیسے اگر کسی کو یہ بات معلوم ہو جائے تو پھر —— سب گھنے گھنے طعنے دیں گے۔ اماں سے اتنی ہی محبت ہے تو پھر شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

طعنوں کے خیال ہی سے اماں بی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اتنی سردی میں پسینے چھوٹ گئے۔ اماں بی تکیے میں منہ چھپا کر چپکے چپکے رونے لگیں —— "میرے بچے، میرے لعل، ماں صدقے، ماں تیری محبت پر سے واری۔" ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

چار چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اماں بی کے شوہر عین جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اماں بی نے محلے کی لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھا پڑھا کر بچوں کو

پالا- دونوں لڑکوں کو پڑھایا—— دونوں لڑکیوں کا جہیز جوڑا- جیسے تیسے لڑکیوں کی شریف گھرانوں میں شادیاں کیں- اماں بی جیسی نیک اور سمجھ دار بی بی کی سارے خاندان میں دھوم مچی تھی- ماں اگر مصیبتوں سے ذرا بھی گھبرا جائے تو یتیم بچے بہک جاتے ہیں' مگر اماں بی نے تو بچوں کو کبھی یتیمی کا احساس ہونے ہی نہ دیا- دونوں لڑکوں کی تعلیم پر اتنی توجہ دی کہ وہ کتاب کا کیڑا بن گئے- ماجد میاں نے ایف ایس سی نان میڈیکل کا امتحان دیا' تو پھر وظیفے کے مستحق قرار پائے- ساجد نے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن پائی- خاندان والے مبارک سلامت کا شور بھی مچاتے اور جی ہی جی میں کڑھتے بھی- وہ اپنے مسٹنڈے بیٹوں کو گلے گلے تک نعمتیں ٹھنساتے مگر کوئی بھی امتحان میں سیکنڈ ڈویژن سے آگے نہ جاتا- یہاں یہ حال کہ دال روٹی اور کبھی کبھار گائے کا گوشت کھانے والے ہوا پر اڑے جا رہے تھے-

ماجد انجینئرنگ کالج میں تیسرے سال کا امتحان دے رہے تھے کہ ساجد نے ایف ایس سی میڈیکل میں ٹاپ کیا اور آرام سے میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے- اس دن اماں بی نے خدا کے حضور میں سارا دن عبادت میں گزارا-

وقت جب امیدوں اور آرزوؤں سے بھرپور ہو تو گزرتے دیر نہیں لگتی- ماجد نے انجینئرنگ کالج سے آخری سال کا امتحان دیا اور اول آکر سب کو حیران کردیا- انہیں انگلینڈ جانے کے لئے سرکاری وظیفہ بھی مل گیا- سارا خاندان اماں بی کی اس خوش نصیبی پر ٹوٹ پڑا- جو کبھی دو پیسوں کی مدد کے روادار نہ تھے- مٹھائیوں کے ڈبے اٹھائے چلے آ رہے تھے' مگر اماں بی کی عجیب حالت تھی- وہ بلک بلک کر رو رہی تھیں- "میں نہیں جانے دوں گی- بیٹیاں پرائی ہو گئیں- یہی دونوں لڑکے میری زندگی کا سہارا ہیں- میرے بڑھاپے کی لکڑی ہیں- میں کسے تھام کر چلوں گی-"

سب حیران تھے کہ گھر آئی دولت کو کوئی اس طرح بھی ٹھکراتا ہے- سب کو ان کی دانائی پر شبہ ہونے لگا- سب انہیں خود غرض سمجھنے لگے- بیٹیوں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ آپ ماجد بھائی کے روشن مستقبل کو لات مار رہی ہیں- ماجد اماں بی کو لپٹائے بڑی مظلومیت سے بیٹھے تھے- وہ اماں بی کے انکار پر خاموشی اختیار کئے

ہوئے تھے۔ اماں نے روتے روتے ایک بار غور سے ان کی آنکھوں میں جھانکا اور آنسو پونچھ لئے۔ "جائے گا' میرا بیٹا ضرور جائے گا۔" انہوں نے سب کے سامنے بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کیا۔ "میں تو یوں ہی رو رہی تھی' بس یوں ہی۔"

ماجد میاں جب جانے لگے تو سب نے محسوس کیا کہ ساجد اپنے بھائی کو رخصت کرنے ہوائی اڈے پر بھی نہیں گئے۔ وہ گھر میں بیٹھے اماں بی کو لپٹائے ان کے آنسو پونچھتے رہے۔ اس کے بعد تو وہ جیسے اماں بی کا سایہ بن گئے۔ اپنا بستر اماں کے بستر کے قریب بچھا لیا۔ کالج اور پھر گھر۔ رات گئے تک پڑھتے رہتے۔ اماں بی کے خراٹے انہیں ذرا بھی پریشان نہ کرتے۔ کبھی کبھی سوتے میں وہ روتیں۔ ماجد کو آوازیں دیتیں' تب وہ کتابیں چھوڑ کر اٹھتے۔ اماں بی کے سینے پر سر رکھ کر انہیں جگاتے۔ ان کے آنسو پونچھتے اور اپنے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے انہیں نیند کی ایک اور گولی کھلا دیتے۔

کبھی کبھی اماں بی پوچھتیں۔ جب تم یہاں کی پڑھائی ختم کر لو گے تو کیا پتا تم کو بھی سرکار وظیفہ دے دے۔ تم پڑھائی میں ہمیشہ اچھے رہے ہو۔ تم نے ہمیشہ وظیفہ لیا ہے۔

ساجد میاں ہنس پڑتے۔ "اماں بی میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ میں ایسے وظیفوں پر تھوکتا بھی نہیں۔"

پھر بھی شک کی سل اماں بی کے سینے کو کچلتی رہتی۔

بہنوں نے ساجد کو جب اس طرح اماں کی پٹی سے لگا دیکھا تو سلگ اٹھیں۔ "کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ مہینوں ساجد بھائی کی صورت نہیں دکھائی دیتی۔ اماں بی آپ نے انہیں لونڈیا بنا کر گھر بٹھا لیا ہے۔ اللہ حافظ ہے جو امتحانوں میں بھی پاس ہوں——"

اماں بی ساری باتیں خاموشی سے سہہ جاتیں اور ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیتیں۔ بیٹیوں کو یہ بھی نہ دکھائی دیتا کہ ان کی اماں کتنی لٹ گئی ہیں۔ ماجد کی جدائی نے انہیں ایک دم سے بوڑھا کر دیا ہے۔ جب ماجد کے خط آتے تو پہروں انہیں آنکھوں سے لگائے بیٹھی رہتیں۔

دو سال بعد ماجد وطن واپس آئے تو تحفوں سے لدے پھندے تھے۔ دونوں بہنیں بھائی سے مرعوب ہو کر جیسے بچھی جا رہی تھیں۔ اترا اترا کر خاندان والوں کو تحائف دکھا رہی تھیں اور اماں بی کو ماجد اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ جی چاہتا اٹھا کر پلکوں پر بٹھا لیں۔

اتنی اعلیٰ تعلیم کے بعد ماجد کو ملازمت تو مل گئی مگر ماجد میاں بجھ سے گئے۔ آٹھ نو سو روپے ان کے بھاویں تلے نہ آتے پھر بھی کسی سے کچھ نہیں کہا۔ سارا دن جانے کن چکروں میں پھرا کرتے اور شام کو گھر آتے تو اماں بی کی گود میں سر رکھ کر اپنے شاندار مستقبل کی باتیں کرتے رہتے۔ اماں بی ان باتوں کو سن کر نہال ہوتی رہتیں۔ وہ بڑے چاؤ سے ساجد کو بھی ان باتوں میں شامل کرنا چاہتیں مگر وہ سر جھکائے پڑھنے میں مصروف رہتے۔

ماجد کبھی کبھی ساجد پر اعتراض کرتے۔ "یار یہ تم لونڈیوں کی طرح سر جھکائے بس پڑھتے ہی رہتے ہو۔ کسی وقت باہر بھی نکلا کرو۔ دنیا کو دیکھو اور سمجھو۔"

"باہر گھومے تو پڑھے خاک۔ پتا ہے کتنی مشکل پڑھائی ہے۔ ڈاکٹر بننا کوئی آسان کام تو نہیں۔ تم کو کیا معلوم، تمہاری جدائی نے مجھے کتنا کمزور کر دیا ہے۔ جب میرا بیٹا ڈاکٹر بن جائے گا تو پھر میرا علاج کرے گا۔" اماں بی چاؤ سے کہتیں۔

ایک سال ملازمت کرنے کے بعد ماجد نے بڑے آرام سے اماں کو بتایا کہ وہ واپس انگلینڈ جا رہے ہیں۔ یہاں ان کے علم کا جو معاوضہ ملتا ہے وہ اس سے کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہو سکتے۔ چند لمحوں تک اماں بی پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی مگر جب ماجد نے ان کی گود میں سر رکھ کر ان کی اجازت چاہی تو وہ بڑی مشکل سے ہاتھ اٹھا کر ان کے سر پر رکھ سکیں، انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے جسم و جاں کا ایک ایک چپہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا ہے۔

ماجد نے بڑے لاڈ سے اماں بی کے گلے میں جھول جھول کر انہیں سمجھایا۔ "اماں بی صرف چند برسوں کی بات ہے۔ وہاں سے میں آپ کو اتنا کچھ کما کر بھیجوں گا کہ آپ ماضی کے سارے دکھ بھول جائیں گی۔ یہ تین کمروں کا پرانا مکان کوٹھی

میں بدل جائے گا۔ بس آپ ایک اچھی سی بہو ڈھونڈ رکھیے گا اور-----" وہ اور جانے کیا کچھ کہتے رہے مگراماں بی نے کچھ بھی نہ سنا۔ ان کے کانوں میں جیسے کہیں بہت دور سے سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر چند دنوں بعد ماجد چلے گئے۔ دونوں بہنوں اور بہنوئیوں نے ڈھیر ساری فرمائشوں اور خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔ اس وقت کسی نے بھی پلٹ کر یہ نہ دیکھا کہ اماں بی آنگن کی پرانی کائی لگی دیوار سے ٹیک لگائے کیوں چپ چاپ کھڑی تھیں۔ کسی کو یہ نظر نہ آیا کہ وہ اس دکھیا کی طرح سر سے پاؤں تک جل رہی ہیں جو نہ تو کوئلہ ہوئی نہ راکھ۔

جب ساجد' بھائی کو رخصت کر کے لوٹے تو انہوں نے اماں بی کو لپٹا لیا۔" اماں بی' میں جو ہوں آپ کے پاس۔"

محبت کے ٹھنڈے چھینٹوں نے ان میں اتنی جان ڈال دی کہ وہ آکر اپنے بستر پر لیٹ گئیں اور ساجد کا سر اپنے سینے سے لگا کر ماجد کو دعائیں دینے لگیں۔" خدا کرے میرا بیٹا وہاں خوش رہے۔ اس کا مستقبل چاند اور تاروں کی طرح روشن رہے اور تم میرے بیٹے مجھ سے کبھی جدا نہ ہونا۔"

پندرہ بیس دن بعد ماجد کا خط آیا تو اماں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ارے کتنا بے وقوف ہے' مجھے یاد کر کے روتا ہے۔ کوئی ہمیشہ تو وہاں نہیں رہے گا۔ ایک دو سال بعد آجائے گا۔"

سارا دن خط کو چومتی اور بار بار پڑھتی رہیں۔

ایک سال کے اندر اندر ماجد نے اماں بی کو اتنا کچھ بھیجا کہ انہوں نے پانچ کمروں کی چھوٹی سی کوٹھی بنوالی۔ پھر کمروں کی تقسیم بھی کر دی۔ سب سے بڑا کمرہ ماجد کا۔ اس سے چھوٹا ساجد کا' اس سے چھوٹا ان کا اپنا۔ کوٹھی بنانے کے بعد وہ چپکے سے ماجد کی دلہن کی بری کا سامان خریدنے لگیں۔ اب ان کی خواہش تھی کہ ماجد جلد واپس آجائے' وہ ہر ایک سے کہتی رہتیں۔ "ممتا کوٹھیوں میں رہے یا محلوں میں۔ بچے جدا ہوں تو سب کھنڈر معلوم ہوتا ہے۔"

سارا خاندان ان کی باتیں سن کر بڑبڑاتا۔ "توبہ کیسی ناشکری ماں ہے۔

ماجد یہاں رہتا تو کون سے سونے کے انڈے دیتا۔ کیا رکھا ہے یہاں۔"

کبھی کبھی ساجد جواب دے بیٹھتے۔ "کیا نہیں ہے یہاں درختوں کو پالو پوسو اور جب وہ پھل دیں تو دوسرے ملکوں میں کھانے کو بھیج دو۔ واہ کیا بات ہے۔"

بہنوں نے یہ باتیں سنیں تو پنجے جھاڑ کر ساجد کے پیچھے پڑگئیں۔ اب دیکھیں گے تم ڈاکٹر بن کر کیا کرو گے۔ آج کل ایم بی بی ایس کو کون پوچھتا ہے۔ کسی سڑی سی گلی میں ڈسپنسری کھولو گے اور سارا دن بیٹھے مکھیاں مارا کرو گے۔ پیسے والے تو بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والے ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے' اس گلی کی مکھیاں تو مرجائیں گی۔" ساجد ہنستے تو بات ٹل جاتی۔ ایک سال تک ماجد کا خط نہ آیا۔ اماں بی کی آنکھوں میں انتظار کی آندھیاں آتیں مگر کوئی خط اڑ کر نہ آتا۔ وہ ساجد سے کچھ نہ کہتیں۔ وہ اسے پریشان نہ کرنا چاہتی تھیں۔ آخری امتحان میں ایک دو مہینے رہ گئے تھے۔

آخر آندھی تھمی۔ ماجد کا خط آگیا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے وہاں شادی کرلی ہے۔ وہیں کی شہریت اختیار کرلی ہے۔ شادی کے وقت اسے اماں بی بہت یاد آئیں۔ وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر ایلس نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر تسلی دی تو قرار آگیا۔ آخر میں لکھا تھا کہ آپ کی بہو آپ سے ملنے کو بے چین ہے۔

اماں بی خط پڑھنے کے بعد دیر تک اکیلی بیٹھی کانپ کر روتی رہیں۔ انہیں ایلس کی ذات سے نفرت ہو گئی۔

شام کو دونوں بیٹیاں اماں بی کے پاس آئیں۔ دونوں رنجیدہ تھیں۔ دونوں ایلس کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ اماں بی نے پہلی بار بیٹیوں پر طنز کیا۔

"اس کا مستقبل بن گیا۔ اب تم لوگ خوش ہو' تمہاری خواہشیں پوری ہو گئیں۔"

بڑی بیٹی تو اس وقت چپ ہو گئی مگر چھوٹی بیٹی کس طرح چپ رہتی۔ "کوئی ہم نے سکھا کر بھیجا تھا کہ وہاں پھیکے شلجم سے شادی کرلینا' وہیں کے ہو رہنا' آخر تو دنیا علم سیکھنے جاتی ہے۔ لوگ اسی طرح ترقی کرتے ہیں۔ آپ کو تو بس الزام رکھنا آتا ہے۔"

اس دن پہلی بار ساجد نے اپنی چھوٹی بجیا کو ڈانٹا۔ "کسی وقت تو آپ اپنی زبان کو قابو میں بھی رکھا کریں۔"

"کیوں قابو میں رکھوں؟ ماجد یہاں ہوتے تو شادی نہ کرتے۔ کون سا اماں کے پہلو سے لگے بیٹھے رہتے۔ اب تم نہ کرنا شادی ہاں۔"

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اماں بی کے دل پر چوٹ سی لگی۔ "جب ساجد شادی کرے گا تو ــــ تو ــــ؟"

رات کو جب اماں بی کی بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں تو اماں بی چپکے سے بکس روم میں گئیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بڑے بکس کا تالہ کھولا اور ماجد کی دلہن کے لئے جو بری بنائی تھی، اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ پھر بکس کو بند کر کے جب وہ تالہ لگانے لگیں تو جیسے سارے جسم کی طاقت ان کے ہاتھوں میں آ گئی۔ "اب یہ تالہ کبھی نہیں کھلے گا۔" وہ زیر لب بڑبڑائیں اور پھر بڑے سکون سے آ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئیں۔

جس دن ساجد نے ایم بی بی ایس کے آخری سال کا امتحان دیا تو اس دن اماں بی سارا دن خدا سے گڑگڑا کر دعائیں کرتی رہیں کہ ان کا بیٹا اچھے نمبروں سے پاس نہ ہو۔ اسے اب کوئی وظیفہ نہ ملے۔

مگر چند ماہ بعد نتیجہ نکلا تو ان کی دعاؤں کے برعکس تھا۔ سارا خاندان مبارک بادوں سے جھولیاں بھرے سارے گھر میں دندناتا پھر رہا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں اماں بی ساجد کو سرجری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ماجد کے پاس بھیج دیجئے۔ اب تو وہاں اپنا گھر بھی ہے۔ ایلس ایسی بری بھی نہیں اگر بری ہوتی تو ماجد بہنوں کو کس طرح پوچھ سکتا تھا۔ ابھی اس نے بچوں کو روپے اور کپڑے بھجوائے تھے۔" بڑی بیٹی نے نظریں جھکائے جھکائے اماں بی کو مشورہ دیا۔ اس وقت کلرک شوہروں کی بیویوں کی ازلی مظلومیت ان کے چہرے پر برس رہی تھی۔ اگر ساجد بھی چلا جاتا تو دونوں بہنوں کے حق میں بہت اچھا ہوتا اور پھر انہیں یہ بھی پتا تھا کہ ماجد کے مقابلے میں ساجد بہنوں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

"اماں بی اگر مائیں اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر نہ کریں گی تو پھر کون

کرے گا؟ چھوٹی بیٹی نے ماں کو گم سم دیکھ کر بڑی بہن کا ساتھ دیا —— اماں بی سامنے بیٹھے ساجد کی آنکھوں میں عجیب طرح سے جھانک رہی تھیں۔

"چھوٹی بجیا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں یہیں کسی گلی میں ڈسپنسری کھولوں گا۔ میں یہاں رہ کر آپ بہنوں کی زیادہ خدمت کروں گا۔" ساجد نے اس طرح کہا کہ اس لہجے کا طنز نمایاں تھا۔

دونوں بہنیں اس طرح بھڑ گئیں جیسے ان کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"مت جاؤ، ہمیں کیا، جب تمہاری ڈسپنسری پر مکھیاں بھنکیں گی، تو پھر پوچھوں گی۔" بڑی بجیا کھسیانی ہو رہی تھیں۔

"تم آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ تیئس چوبیس سال کے پورے آدمی ہو اور ننھے بچوں کی طرح اماں کی پٹی سے پٹی جوڑ کر سوتے ہو۔ مگر بات اس طرح کرتے ہو جیسے اپنی بہنوں کے ان داتا ہو۔ ارے بھیا تم ترقی کرو گے تو ہم خوش ہوں گے اور بس۔" چھوٹی بجیا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

ساجد کے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی دونوں بہنیں ناراض ہو کر چلی گئیں۔ اماں بی خاموش بیٹھی سب کا منہ تکتی رہ گئیں، ویسے بھی اب ان میں اتنی طاقت کہاں رہ گئی تھی کہ جلدی سے اٹھ کر روٹھی ہوئی بیٹیوں کو منا لیتیں۔ ماجد کی جدائی، ڈائن بن کر انہیں چاٹ گئی تھی، اس پر یہ فکر کہ اگر ساجد کی ڈسپنسری نہ چلی تو ——؟

ساجد میاں کی ڈسپنسری اور ان کے ہاتھ کی شفا ایسی مشہور ہوئی کہ جو عزیز دار چھوٹے ڈاکٹروں کے پاس بھی نہ جاتے وہ بھی مفت علاج کرانے دوڑ پڑے اور اماں بی کے سینے پر دھری ہوئی شک کی سل بھی آخر کو سرک گئی۔ پھر بھی رات کو سوتے سوتے ایک بار ہاتھ بڑھا کر ساجد کے سر کو چھوتیں اور پھر اس احساس کے ساتھ سو جاتیں کہ وہ ان کے پاس ہے۔

خواب آور دوائیں کھانے کے باوجود کبھی کبھی انہیں رات دیر سے نیند آتی۔ وہ سوچتیں کہ اب ساجد کی شادی کر دیں، مگر اس خیال ہی سے وہ الجھ کر رہ جاتیں کہ تنہائی اور بڑھاپا ان سے کیا سلوک کرے گا۔ ساجد بھی ماجد کی طرح بدل

نہیں جائے گا۔ خاندان والے طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ بیٹیاں ان کے منہ پر کہہ گئی تھیں کہ اماں بی ساجد کی شادی نہیں کریں گی۔ اسے کولہے سے لگائے لگائے بوڑھا کر دیں گی۔ انہوں نے بڑی صفائی سے کہا تھا کہ جب ساجد اپنے ہم عمروں کو چار چار بچوں کا باپ دیکھتا ہوگا تو کیا سوچتا ہوگا۔ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی وہ جیسے بہری بن جاتیں۔

بہت مدتوں کے بعد ماجد اور ایلس کا خط آیا تھا۔ ایلس کا خط پا کر انہیں بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اس نے بڑی صاف اردو میں پہلی بار اپنی ساس کو خط لکھا تھا۔ ساجد کے خط میں خاص بات یہی ایک تھی کہ وہ اپنی اماں بی کو بہت یاد کرتا ہے۔ وہ بہت مصروف تھا۔ اس لئے خط نہ لکھ سکا ——— اور ایلس نے لکھا تھا:

"اماں بی ——— کل جب ماجد کو کاموں سے فرصت ملی تو وہ آپ کو یاد کر کے بہت رویا۔ وہ ضد کر رہا تھا کہ وہ فوراً" اپنی اماں بی سے ملنے جائے گا۔ وہ اس وقت یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ بہت جلد پھر باپ بننے والا ہے۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ وہ لوگ جن کا حال ان کی دسترس سے باہر ہے اور مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور وہ لوگ جن کا مستقبل انتظار کر رہا ہے۔ آخر انہیں ایک دوسرے کی جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے اور ———"

اماں بی نے خط کو لفافے میں بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ سارا خط پڑھنے کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ دیر تک تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہیں اور چہرے کی جھریوں کی تہوں میں لکھی ہوئی مستقبل کو جنم دینے والی ماضی کی داستان آنسوؤں سے دھلتی رہی۔

رات جب ساجد یہاں اماں بی کے ململ کے سفید جھاگ جیسے دوپٹے کو آنکھوں پر لپیٹے سونے کی کوشش کر رہے تھے تو اماں بی نے ان کو آہستہ سے پکارا۔

"ساجد بیٹے؟"

"ارے آپ ابھی تک سوئی نہیں اماں بی؟"

"بیٹے ——— میں سوچ رہی تھی کہ اب تمہاری شادی کر دوں۔"

"شادی؟" ساجد میاں حیرت کدہ بن گئے۔ وہ بیٹھ کر اماں بی کا منہ تکنے

لگے- وہ تو شادی کا خیال ہی دل سے نکال چکے تھے- شادی کے خوب صورت تصور میں انہوں نے کتنی راتیں گزاری تھیں- کتنے خوابوں میں ایک سے ایک خوب صورت دلہن نتھ اور ٹیکا چمکاتی، ان کے سینے کو روندتی ہوئی غائب ہو گئی تھی-

"تم حیران کیوں ہو رہے ہو بیٹے؟" اماں بی تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں-

"اماں، میں شادی نہیں کروں گا- میں نہیں چاہتا کہ آپ کی محبت میں کوئی اور حصے دار بنے-" انہوں نے بہت صاف آواز میں جواب دیا-

"بیٹے، وہ لوگ جن کا دل ان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے اور مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو ان کے مقابلے میں وہ لوگ جن کا مستقبل ان کا انتظار کر رہا ہو، انہیں آخر ایک دن ایک دوسرے سے جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے- میرا کیا آج ہوں، کل نہیں ہوں-"

"اماں بی—— یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں-" ساجد میاں کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی-

"سو جا پگلے، مجھے اب نیند آ رہی ہے-" لیٹ کر اماں بی نے لحاف سر تک کھینچ لیا اور پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ لیمپ کا سوئچ آف کرنے کے بعد ساجد کب تک ایک ہی طرح سے بیٹھے رہے-

چھوٹی بجیا بند دروازوں کو پیٹ رہی تھیں- ساجد نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا-

لڑکیاں زور زور سے گا رہی تھیں-

"بنو تیرے ابا کی اونچی حویلی-"

بنی میں ڈھونڈتا چلا آیا-

"بھئی حد ہے- شام ہونے والی ہے اور ماں بیٹے مزے سے سو رہے ہیں- ابھی تو دلہن کا کمرہ سجانا ہے- اماں بی ماجد کا کمرہ سجا دوں- سب سے بڑا اور شاندار ہے-" چھوٹی بجیا کمرہ سجانے کے خیال سے ہی سرخ پڑی ہوئی تھیں-

"نہیں بیٹی، ساجد والا کمرہ سجاؤ- جب کبھی وہ تم لوگوں سے ملنے آئے گا تو اپنے کمرے میں ٹھہرے گا-"

"ان کا کیا پتا اماں بی۔ اگر بھابی کے ساتھ آئے تو آٹھ دس دن کو آئیں گے۔ اکیلے آئے تو آپ کے کمرے میں رہیں گے۔" چھوٹی بجیا رنجیدہ ہو گئیں۔ "اللہ قسم وہ کمرہ سب سے زیادہ شاندار ہے۔ ایسا سجے گا ایسا——"

"ٹھیک ہے مگر اس کا کمرہ مت سجانا۔ وہ ماجد کا کمرہ ہے۔ کسی کی چیز نہیں چھینتے بیٹی۔ گناہ ہوتا ہے۔" اماں بی کی آواز بھرا گئی۔

"کیا فضول باتیں ہیں چھوٹی بجیا۔ جو کچھ اماں بی کہیں وہی کیجئے۔ اماں بی آپ خیال نہ کیا کیجئے چھوٹی بجیا تو ہمیشہ کی ضدی ہیں۔"

"آج تم کچھ بھی کہہ لو میں سب سن لوں گی۔" وہ ہنستی ہوئی چلی گئیں۔

"میں اب ڈسپنسری جا رہا ہوں اماں بی۔ آپ آرام سے بیٹھیے گا۔ کام کرنے نہ اٹھ جایئے گا۔" جوتوں کی ڈوریاں باندھ کر وہ جلدی سے چلے گئے۔

اماں بی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ذرا دیر پہلے کی ہوئی بات انہوں نے پھر نہیں دہرائی۔ پھر بھی وہ ساجد کے وحشت زدہ چہرے اور کڑے تیوروں سے ڈری ہوئی تھیں۔ ڈھول پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں چائے پینے کے بعد اب چلتے پھرتے گانے گا رہی تھیں۔

"لٹھے دی چادر اتے سلیٹی رنگ ماہیا
آجا سامنے' بہہ جا سامنے' کولوں تے رُس کے نہ لنگھ ماہیا"

جب اماں بی دلہن کو رخصت کرا کے لائیں تو وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں' مگر آرسی مصحف اور منہ دکھائی کی رسم کے بعد جب دلہن کو اس کے کمرے میں لے گئے تو ان کے دل پر ایک دم سناٹے نے جیسے یلغار کر دی۔ اب ساجد بھی چلا جائے گا۔ آج انہوں نے اسے کھو دیا۔ کوئی جذبہ ان کا دل نوچے لے رہا تھا۔ ادھر سارے دن کی تھکن انہیں آنکھیں نہ کھولنے دے رہی تھی۔

ساجد کی نظریں مسلسل اماں بی کا پیچھا کر رہی تھیں' وہ اپنے بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور جب رشتے کی بھاوجیں انہیں لینے آئیں تو وہ بے حد پریشان ہو گئے۔ "میں ابھی نہیں جاؤں گا۔ اماں بی بہت تھک گئی ہیں۔" انہوں نے اماں بی کو سہارا دے کر آرام سے لٹا دیا۔ پھر الماری سے نیند کی دوا نکال کر دو گولیاں

کھلائیں- پھر ان کے پائنتی بیٹھ کر سوچ ہوئے پیروں کو آہستہ آہستہ ملنے لگے۔

"بڑی بجیا آج یہاں اماں بی کے پاس میرے بستر پر آپ لیٹ جاتے۔" انہوں نے بڑی امید سے بڑی بجیا کو دیکھا۔

"میں یہاں آرام سے چھپر کھٹ پر لیٹ جاؤں تو میری سیلیاں برا نہیں مانیں گی- وہ سب بے چاریاں قالینوں پر لڑھکتی رہیں-" بڑی بجیا نے سمجھانے کے انداز سے کہا۔

"تو پھر آپ چھوٹی بجیا-" وہ کھسیا رہے تھے۔

"اللہ' ساجد تم نے تو میری اماں بی کو دودھ پیتا بچہ بنا دیا ہے- اماں بی تو آج اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر آرام سے سوئیں گی۔"

ساری بھاوجوں نے قہقہے لگاتے ہوئے ساجد کو پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا اور وہ تھے کہ اماں بی کو بے بسی سے دیکھے جا رہے تھے۔

"ارے جاتے کیوں نہیں بیٹے- میں تو سو رہی ہوں' میری تو تھکن سے آنکھ بھی نہیں کھل رہی۔"

"ابھی نہیں جاؤں گا- میں چلا جاؤں گا-" انہوں نے بھاوجوں سے خود کو چھڑا کر پھر اماں کے پاؤں پکڑے اور آہستہ آہستہ دبانے لگے۔

بھاوجیں کچھ ناراض سی ہو کر چپ چاپ کھڑی ہو گئیں- اماں بی سچ مچ ذرا دیر میں خراٹے لینے لگیں۔

رات کو ڈھائی بجے کے قریب وہ کچھ سوتی کچھ جاگی سی تھیں کہ انہوں نے عادت کے مطابق ہاتھ بڑھا کر ساجد کے اوپر رکھ دیا- پھر ایک دم ہڑ بڑا کر اٹھ گئیں- پاؤں دباتے دباتے یہ پگلا یہیں سو گیا- انہوں نے جلدی سے ٹٹول کر لیمپ کا سوئچ آن کیا۔

"کیا کہیں گے سب' یہاں سو گیا ہے-" انہوں نے سارے کا سارا لحاف کھینچ لیا- گاؤ تکیے پر اسی طرح لحاف پڑا تھا کہ اماں بی کو ایک دم ہنسی آ گئی- "اس نے سوچا ہو گا کہ اماں بی رات کو ایک بار اس پر ہاتھ رکھتی ہیں- وہ ہاتھ رکھیں گی اور پھر سو جائیں گی- رات جانے کس وقت آ کر یہ کارروائی کر گیا ہے۔"

سوچتے سوچتے وہ برابر مسکرا رہی تھیں۔ انہوں نے سرہانے سے گلاس اٹھا کر پانی پیا، پھر گاؤ تکیے کو چوم کر اسی طرح رکھ کر لحاف ڈال دیا۔ لیمپ بجھایا اور پھر لیٹ گئیں۔ ماجد تو اپنے مستقبل کی خوشی میں ماضی کے سرہانے تکیہ رکھنا بھی بھول گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جنہیں جلدی سے دوپٹے کے آنچل سے پونچھ لیا اور کروٹ لے کر بڑے پیار سے گاؤ تکیہ پر ہاتھ رکھ کر چند منٹ اسے ٹٹولتی رہیں اور پھر آرام سے سو گئیں۔

# فیصلہ

رات کے کوئی آٹھ نو بج رہے تھے کہ سلیم کی لاش ایمبولینس پر گھر لائی گئی۔ محلے والوں نے مارے ہمدردی کے ایمبولینس کو دیکھتے ہی گھیرے میں لے لیا۔

شام کو جب صمد میاں اپنے داماد کو دیکھنے اسپتال گئے تھے تو ان کی حالت بگڑ چکی تھی۔ ڈاکٹروں کی ساری تدبیروں کو ٹھکرا کر موت ان کی آخری سانسوں سے الجھ رہی تھی اور ان کے دیکھتے دیکھتے ان کی بیٹی کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ صدمے سے نڈھال صمد میاں لکڑی کی بنچ پر تنہا بیٹھ کر روتے رہے اور انہیں یہ فکر پڑ گئی کہ میت کس طرح گھر لے جائیں۔ آج شام وہ اکیلے ہی اسپتال آئے تھے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ اتنی جلدی یہ نازک لمحہ آجائے گا۔ صبح گھر کے تمام افراد دیکھنے آئے تھے اور سلیم کو چاق و چوبند دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ خود انہیں بھی پوری طرح اطمینان ہو گیا تھا۔ ایک دن پہلے ان کے داماد پر ہلکی سی غنودگی کا دورہ پڑا تھا اور ڈاکٹروں نے ایک بار صمد میاں کو الگ لے جا کر مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ مگر آج صبح سلیم کو اسی طرح ہنستا بولتا دیکھ کر ڈاکٹروں تک کو امید بندھ گئی تھی اور صمد میاں جو اپنی بیوی اور بیٹی کو خطرے کا احساس دلانے کی سوچ رہے تھے۔ امیدوں کا دامن پھیلا بیٹھے۔ بھلا کسے پتہ تھا کہ یہ موت سے پہلے کا سنبھالا ہے۔ ڈاکٹروں نے ان کی تنہائی پر رحم کھا کر خود ہی ایمبولینس کا انتظام کرا دیا۔

جوان جہان بانو نے جب اپنے شوہر کو اس طرح گھر آتے دیکھا تو اسے گھمیری سی آگئی۔ بیمار کی باتیں اور ہنسی کیا اتنی غیر معتبر ہو سکتی ہے۔ صبح کی ملاقات کے وقت وہ سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا تھا اور جب وہ جانے لگی تھی تو اس نے کچھ ایسی محبت سے بانو کو دیکھا تھا کہ وہ سارا دن سرشار رہی تھی۔ کئی بار ماں

سے کہا تھا۔ "اب دیکھ لینا امی وہ اسپتال سے آکر بالکل بدل جائیں گے۔ آج تو انہوں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ اماں اسپتال کیوں نہ آئیں۔ اگر مجھ سے پوچھتے تو صاف کہہ دیتی کہ تمہاری اماں کو تم سے ہے بھی بڑی محبت جو روز بھاگی آئیں' امی اب تو وہ آپ کے احسانوں تلے ایسے دبے ہیں کہ ساری زندگی کے لئے غلام ہو جائیں گے۔ پھر میں پوچھوں گی ان کی اماں اور ابا سے' اب چلاؤ اپنے حکم پر تو جانوں۔"

محلے والوں نے میت کو سہارا دے کر کھاٹ پر لٹا دیا تو بانو کی ماں نے بستروں کے ڈھیر سے دو تین گدے کھینچ کر زمین پر بچھا دیے اور پھر بانو کو تھام لیا جو وحشت سے آنکھیں پھاڑے منہ کھولے دم بخود کھڑی تھیں۔ اس کا دوپٹہ شانوں پر سے ڈھلک کر نیچے گر گیا تھا اور دونوں ہاتھ جیسے مفلوج ہو کر لٹک گئے تھے۔ بانو کی ماں نے اسے زور سے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔

محلے کی عورتیں آ آکر گدوں کے فرش پر بیٹھتی جا رہی تھیں اور بانو کو ہمدردی سے دیکھ رہی تھیں۔

"ارے بہن اسے رلاؤ! نہیں تو سکتہ ہو جائے گا۔" ایک بوڑھی عورت نے بانو کی ماں کو مشورہ دیا۔

بانو نے سب کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کانپے' ہاتھ ہلے اور پھر وہ اپنے سینہ پر دو ہتڑ مارنے لگی۔ پھر بھی اس کی آنکھ میں آنسو نہ آئے' ماں نے جلدی سے بیٹی کے ہاتھوں کو مضبوطی سے۔ "تیرے دشمن سینہ کوٹیں میری بچی۔ تیرے لئے کس چیز کی کمی ہے' تیرا لال زندہ سلامت رہے' تیرا باپ بھائی جیوے۔ تیرے پیچھے سب کچھ لٹا دیا تو کیوں ماتم کرے۔ ماتم وہ کریں جنہوں نے ساری زندگی تیرے شوہر کو نوچ نوچ کر کھایا' اب روٹیوں کے لالے پڑ جائیں گے۔" بانو کی ماں نے رخساروں پر ڈھلکتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے' ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا بس نہیں چلتا جو اپنی بیٹی پر سے صدقے ہو جائے' مر جائے مگر اس کا دکھ سمیٹ لے۔

محلے کی عورتیں کریدنے والی نظروں سے بانو کی ماں کو دیکھنے لگیں اور بانو نے جیسے بڑی مشکل سے خود کو ماں کی گرفت سے چھڑایا اور شوہر کی لاش کی طرف

بڑھی لیکن ماں نے پھر جھپٹ کر اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ "نہ' نہ' میری بچی' تیرا سہاگ تیرا لال ہے' تیرا سہاگ میں ہوں۔ تیری خاطر کیا نہیں کیا۔" پھر محلے والیوں سے مخاطب ہو گئی۔ "سال سے بیمار تھا۔ ماں باپ خیرات کی دوائیں پلاتے رہے' میں نے یہاں لا کر علاج کرایا۔ زیور بیچا۔ اس کی بہن کے جہیز کے پانچ ہزار جمع تھے وہ بھی علاج پر اٹھا دیے' پھر بھی میری بچی کی قسمت میں یہ دن لکھا تھا۔ جب سے شادی کی ہے' اسے ساس سسر نے ایک دن چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ بیواؤں کی طرح رو رو کر سات سال گزار دیئے۔ میں کہتی ہوں پہلے کون سی سہاگنوں والی زندگی گزار رہی تھی جو اب بیوہ ہو گئی۔ اس کے سارے خرچے تو میں ہی برداشت کرتی تھی۔"

"ہے بے چاری بدنصیب"۔ ایک عورت نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اور اب اس کے ساس سسر کہاں ہیں؟" دوسری نے پوچھا۔

"کہاں کیا؟ تین دن ہوئے حیدر آباد سے آ کر یہاں پڑے ہیں۔ کہتے تھے بیٹے کے لئے تڑپ رہے تھے' دل میں برے برے وسوسے آ رہے تھے۔ اب دیکھ لو کہ شام سے کھا پی کر اپنے کمرے میں پڑے سو رہے ہیں۔ اب انہیں برے برے وسوسے نہیں ستا رہے' ان کی بہو بیوہ ہو گئی اور وہ پڑے سو رہے ہیں۔"

"جب بیٹے کی زندگی میں یہ حال تھا تو اب بے چاری بیوہ کے ساتھ کیا سلوک کریں گے!"

"ہائے میری ماں۔" بانو ایک دم زور سے چیخی اور خود کو ماں کے بازوؤں سے چھڑا کر شوہر کی میت پر گر پڑی۔ چادر سے ڈھکا ہوا منہ کھول دیا اور پٹی سے سر ٹکرا ٹکرا کر بین کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ساری عورتیں ہولے ہولے سسکنے لگیں۔ بانو کی ماں اپنی بیٹی کی پشت سے لپٹ کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ پکے پھوڑے کی طرح ٹپکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

قریب کے چھوٹے سے کمرے میں بانو کے سوئے ہوئے ساس اور خسر جیسے کسی بھیانک خواب کو دیکھتے دیکھتے چونک پڑے۔ کم پاور کے بلب کی پیلی بیمار روشنی میں انہوں نے آنکھیں پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ بوڑھے خسر کے ہاتھوں کا

رعشہ اس کے سارے جسم میں دوڑ گیا اور ساس نے اپنی بہو کے بین کی آوازوں کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ خدا وہ دن نہ لائے۔" وہ زور سے بڑبڑائی۔ "یہ رونے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟" اس نے اپنے شوہر کی قوت سماعت کو آخری سہارا بنایا۔ وہ لڑکھڑا کر اٹھی اور پھر بیٹھ گئی۔

"کون ہے؟ بانو؟؟"

"نہیں —— نہیں" بوڑھی ساس دیوانوں کی طرح اٹھی اور اپنے شوہر کو تھام لیا۔ "بانو کیوں رونے لگی۔"

وہ دونوں اپنے جسم کو اس طرح گھسیٹتے ہوئے بانو کے کمرے کی طرف چلے جیسے ان پر نزع کا عالم طاری ہو۔

کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی کھاٹ پر ان کا اکلوتا بیٹا ابدی نیند سو رہا تھا۔ باپ آگے بڑھا مگر محلے کی عورتوں کی موجودگی سے اس کے قدم وہیں تھم گئے اور سر سینے پر جھک گیا اور وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔

ماں دونوں ہاتھوں سے جھکی ہوئی کمر تھامے دہلیز پر کھڑی اس طرح میت کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس کا بیٹا سو رہا ہے بھلا وہ مر سکتا ہے اور عورتیں گردن موڑے اس کی طرف یوں دیکھ رہی تھیں جیسے تماشائی مداری کی طرف دیکھیں' جیسے وہ کسی بڑے دردناک کھیل کی منتظر ہوں۔

"ماں صدقے —— میرا لال آگیا۔" بانو کی ساس آہستہ آہستہ اپنے بیٹے کی میت کی طرف بڑھنے لگی۔ "اب کبھی اسپتال نہ جائیو! آ میں تجھے چھپا لوں۔" اس نے جھپٹ کر اپنے بیٹے کے سرد چہرے کی بلائیں لیں اور پھر ایک چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

عورتوں کا ہجوم بوڑھی ساس کے بھنچے ہوئے دانتوں کو چمچے کی مدد سے کھول کر منہ میں پانی ٹپکانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آگئی اور اپنے اردگرد اس طرح دیکھنے لگی جیسے اندھیرے میں گھر گئی ہو' روشنی تلاش کر رہی ہو' جیسے کوئی سہارا ڈھونڈ رہی ہو مگر کچھ نہ پا کر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور زور سے پکارا۔ "سلیم! میرے لال کہاں ہو' بوڑھی ماں کو اس عمر میں دھوکا دے گئے' لوٹ

آؤ بیٹا —— ماں پردیس میں لٹ گئی —— کس کا سہارا پکڑوں۔"

محلے اور رشتے ناتے کی عورتیں بانو کی ساس کے بین سن کر اونچی آواز میں رونے لگیں تو بانو جو ساس کے آتے ہی چپ ہو کر نڈھال سی سر جھکائے بیٹھی تھی ایک دم تڑپ تڑپ کر کچھ اس طرح رونے لگی جیسے اس کے دکھ کے سامنے سب ہیچ ہو۔ ساری ہمدردی کی صرف وہ مستحق ہو۔ پھر بھی عورتوں نے بانو کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ سب بوڑھی ماں کو گھیرے ہوئے تھیں۔ شاید سب کو اس کے بڑھاپے پر رحم آ رہا تھا۔ رخساروں کی موٹی موٹی جھریوں میں اٹکے ہوئے آنسو، بجھی ہوئی آنکھیں اور جھکی ہوئی کمر۔ وہ مجسم درد بنی ہوئی تھی۔

"صبر کرو بہن! سلیم اب لوٹ کر نہ آئے گا۔" بانو کی ماں کہنے لگی۔ "تمہارا سہارا بانو ہے، تمہارا سہارا تمہارا پوتا ہے، تم کیوں بے آسرا ہونے لگیں۔ بانو سلیم کی طرح تمہاری خدمت کرے گی۔ تم ہی اس کی سب کچھ ہو۔ ماں باپ بیٹی کو پرائے گھر بھیج کر خود غیر ہو جاتے ہیں۔" بانو کی ماں نے بانو کی کمر میں ٹھوکا دے کر اسے ساس کی طرف سرکایا تو وہ رونا بھول کر ذرا حیرت سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ "ساس سسر کے سوا اب تیرا کون سا سہارا رہ گیا ہے۔" بانو نے دونوں ہاتھ ساس کی طرف پھیلا دیئے اور اٹھ کر دو قدم آگے بڑھی۔ "ہائے اماں بانو تو جیتے جی مر گئی۔"

ساس نے امیدوں کے بجھتے دیوں میں سے ایک کو ٹمٹماتے دیکھا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرح بہو کو دیکھنے لگی، جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔ بہو تو اس کے لئے ہمیشہ شکایتوں کا تازیانہ بنی رہی تھی۔ مگر آج ہاتھ پھیلائے اسے سہارا دینے کو اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ساس نے جیسے لپک کر اسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا اور اس طرح اسے ٹٹولنے لگی جیسے کہیں اور کوئی نہ ہو۔ اس کے جسم سے تو اس کے بیٹے کی ہلکی ہلکی مہک اٹھ رہی تھی ۔ ساس بہو اس طرح لپٹ کر روئیں کہ کہرام مچ گیا۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دردناک آوازیں سرد رات کے سناٹے کو دور تک چیرتی چلی گئیں۔ پرلی گلی کے کئی مکانوں کی کھڑکیاں کھلیں اور پھر جیسے ایک کراہ کے ساتھ بند ہو گئیں۔ مگر کمرے کے وسط میں کھاٹ پر لیٹی ہوئی لاش پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نیم

وا آنکھیں' ہونٹوں پر رچی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ ایسا لگتا تھا یہ کہرام اس کے نزدیک شب و روز کے تماشے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

عورتوں نے ساس بہو کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو جو یوں جڑتے دیکھا تو یوں رونے لگیں جیسے خوشی کے آنسو بہا رہی ہوں۔ پھر کہرام مدھم پڑتے پڑتے تھم گیا۔ ساس نے اپنے بیٹے کی جدائی کی آگ میں پھنکتے ہوئے سینے پر بہو کا سر رکھ لیا اور ہولے ہولے تھپکنے لگیں۔ بہو اس کی آغوش میں نڈھال سی پڑی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس وقت ساس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بانو کی جگہ اس کا بیٹا اس کی آغوش میں پڑا ہے۔ کون کہتا ہے کہ وہ بے سہارا ہو گئی۔

"اماں' سلیم چلا گیا۔ وہ روٹھ گیا اماں۔" بانو ہولے ہولے بڑبڑائی۔

"مگر تو جو میری سلیم ہے۔" ساس نے بانو کو تھپکتے ہوئے اپنے دوپٹے کے بھیگے آنچل سے اس کے آنسو پونچھ دیئے اور اس کے سر کو زور سے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ اس وقت وہ سوچ رہی تھی کہ بانو کو اپنے جیتے جی کوئی دکھ نہ ہونے دے گی۔ اب تو یہی اس کی زندگی کا سہارا ہے۔ بانو اگر اس سے نفرت کرتی ہوتی تو آج یوں کلیجے سے کیوں لگی بیٹھی ہوتی۔ جہاں چار برتن ہوتے ہیں کھڑکتے ضرور ہیں۔ وقتی لڑائی جھگڑے نفرت میں تو نہیں بدل جاتے۔ پھر جب وہی نہ رہا تو کیسے گلے' کیسے شکوے۔ کاش وہ زندہ رہتا اور بانو اس سے لڑتی رہتی۔ خدا اس کے اس غرور کو تو نہ چھینتا جس کے بل پر سب کچھ کر گزرتی تھی۔ اب کتنی لٹ گئی ہے۔ اس عمر میں بیوگی کا روگ لگ گیا ہے —— ہائے —— ساس نے ٹھنڈی آہ بھر کر بانو کو غور سے دیکھا۔ سوجی ہوئی سرخ آنکھیں' دکھ کی آگ میں تمتایا ہوا چہرہ —— ساس کا جی چاہا کہ وہ اسے اپنے کلیجے میں چھپا لے۔ دنیا کا کوئی دکھ اسے چھو کر نہ گزرے' اس وقت اسے بہو اپنی جائی لگ رہی تھی جو وقت پڑنے پر اس کے سینے سے آ لگی تھی۔

دیوار پر لگے ہوئے پرانے کلاک نے بارہ بجائے تو محلے سے آئی عورتیں جیسے چونک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میت صبح دس بجے اٹھنی تھی۔ ایسی سرد رات میں بال بچوں کو چھوڑ کر کوئی کہاں تک بیٹھا رہتا۔ وہ سب صبح کو آنے کے لئے کہہ

کر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی بانو کی ماں نے بستروں کے ڈھیر سے لحاف کھینچ کھینچ کر رشتے دار عورتوں کی طرف بڑھا دیئے اور ایک لحاف بانو اور اس کی ساس پر ڈال دیا۔

طویل رات گزارنے کے لئے رشتے دار عورتوں نے اچھی طرح لحاف اوڑھ لئے اور دیواروں سے کمر ٹیک کر آرام سے پاؤں پھیلا دیئے۔

پردے دار عورتوں کے جاتے ہی بانو کا باپ اس کے بوڑھے خسر کو سہارا دیئے کمرے میں آگیا' ایک بار پھر کہرام مچا' بانو اٹھ کر خسر سے لپٹ گئی تو اس کی ماں نے بڑی مشکل سے پانی پلا کر اسے چپ کرایا اور سر سے پاؤں تک کانپتے ہوئے باپ کو تھام کر اس کے بیٹے کی کھاٹ کے پاس بٹھا دیا۔

رو پیٹ کر اب سب لوگ یوں چپ بیٹھے تھے جیسے اپنی فکروں میں گم ہوں۔ بانو کی ماں منہ اٹھائے' دونوں ہاتھ زانو پر رکھے ٹکٹکی لگائے بانو کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ایسا کرب ظاہر ہو رہا تھا۔ جیسے اس کی بیٹی نہیں وہ خود بیوہ ہو گئی ہو۔ بیٹی کے سکھ کی خاطر اس نے سب کچھ داؤں پر لگا دیا۔ مگر ہار کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ بیٹیوں سے کس ماں کو محبت نہیں ہوتی مگر اس کا تو یہ حال تھا کہ اگر بانو اپنی ساس سسر کی شکایتوں سے بھرا ایک خط' دردناک خط لکھ دیتی تو وہ دیوانی سی ہو جایا کرتی۔ بیٹی' داماد اور دونوں بچوں کے جوڑے باگے تیار کرتی' دو تین سیر خالص گھی مہیا کرتی اور پھر تن تنہا حیدر آباد کا سفر کر ڈالتی۔ بانو ماں کو دیکھ کر کلیجہ پھاڑ کے روتی' ساس سسر سے ملے ہوئے دکھوں کا ذکر کرتی۔ ماں اسے سمجھاتی بجھاتی اور یقین دلاتی کہ ایک دن وہ ایسا داؤں لگائے گی کہ اس کے ساس سسر چت ہو جائیں گے۔ پھر سب کو جوڑے بانٹتی۔ داماد کو خالص گھی کا پلاؤ پکا کر کھلاتی۔ بناسپتی کے مضر صحت اثرات کا یقین دلاتی اور پھر بڑے لاڈ پیار اور طور طریقے سے سمجھاتی کہ اب وہ بال بچوں والا ہے' اسے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔ کل کو بچوں کی تعلیم کا زمانہ آئے گا۔ خرچ بڑھیں گے' اس وقت بانو ڈیڑھ سو روپے میں کیا کرے گی؟ ماں باپ کو بڑھاپے میں ایسی کیا ضرورت پڑ گئی ہے جس کے لئے پچاس روپے مہینہ جیب خرچ دیا جائے۔ بس اتنا ہی ٹھیک ہے کہ

ایک ساتھ رہ کر کھاتے پیتے ہیں۔ اب اللہ اللہ کریں، جیب خرچ تو جوانوں کے لئے ہوتا ہے۔ داماد نیا جوڑا پہن کر خالص گھی میں پکے پلاؤ کی خوشبودار ڈکاریں لے کر بڑی سعادت مندی سے ہر بات پر جی جی کرتا رہتا۔ اس کے ہر حکم پر سر جھکا دیتا —— مگر جب وہ واپس آجاتی تو پھر وہی ڈھرا چل پڑتا۔ سال کے بعد بانو اور بچوں کے کپڑے پھٹ جاتے، خالص گھی کی خوشبو یاد کر کے نتھنے پھڑکنے لگتے تو وہ پھر ماں کو ایک دردناک خط لکھ دیتی۔ ماں پھر تیاریاں کر کے بھاگی جاتی اور بانو کو سمجھا آتی کہ آخر تو ایک دن ضرور آئے گا جب اس کا شوہر اس کے احسانوں کے بار تلے دب کر ہر حکم مانے گا، اس کے ساس سسر پچاس روپے مہینے پر گلچھرے نہ اڑا سکیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ داماد سخت بیمار ہے اور اسپتال کی خیراتی دواؤں پر پڑا ہے تو وہ پڑوسن سے دو سو روپے قرض لے کر فوراً پہنچ گئی۔ بانو کی ساس کو بیٹے کے سرہانے سے اٹھا کر خود ڈیرے ڈال دیئے۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو بلا کر بھر مٹھی فیس دی۔ دوائیں منگائیں اور پھر عافیت اس میں سمجھی کہ اس زریں موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، بیٹی، داماد اور بچوں کے علاج کے نام پر اپنے ساتھ لانے پر تل گئی۔ راس سے صاف کہہ دیا کہ وہ تو بیٹے کے لئے اپنے ڈبے سے ایک پیسہ نہ خرچ کرے گی، اس لئے لے جانا ضروری ہے، اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں کب تک پڑی رہے گی۔ ساس سسر نے بہت سمجھایا، سر پیٹا، روئے مگر اس پر ذرا اثر نہ ہوا۔ سب کو بٹور کر اپنے گھر لے آئی۔ بیٹے نے بھی تو اپنے روتے پیٹتے ماں باپ سے کچھ نہ کہا۔ زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔ اسے پتہ ہی تھا کہ ماں باپ کے پاس دھیلا نہیں۔ یوں ہی دواؤں کے نام پر پانی پی پی کر مر جائے گا۔ شاید اسی لئے آتے وقت ماں باپ سے منہ پھیر رہا تھا کہ کہیں دل پگھل نہ جائے۔ بانو کی ماں نے اپنے گھر آکر علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ چھوٹی بیٹی کا جمع کیا ہوا سارا جہیز دکانوں پر پہنچ گیا۔ زیور کے نام کا ایک چھلا بھی نہ بچا۔ محلے میں کوئی ایسا نہ تھا جس سے قرض نہ لیا ہو۔ پھر بھی وہ خوش تھی کہ داماد اب اس کا زر خرید غلام بن گیا ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک کہا تھا کہ صحت یاب ہونے کے بعد اسی کے پاس پڑا رہے گا۔ یہیں نوکری تلاش کر لے گا۔ کسے خبر تھی

کہ وہ داماد کو احسانوں کے بوجھ تلے دباتے دباتے خود جیتے جی بیٹی کے دکھوں کی قبر میں دفن ہو جائے گی۔

برادری کی بوڑھی عورتیں لحافوں میں نیم دراز ہو کر زور زور سے خراٹے لے رہی تھیں اور کمرے کے سناٹے میں ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی موت سے پہلے اٹکی اٹکی سانسیں لے رہا ہو۔

"ہائے بھائی صاحب بانو کا کیا بنے گا؟" بانو کی ماں بڑی رقت بھری آواز میں جیسے فریاد کرنے لگی۔ "ہم تو سر سے پاؤں تک مقروض ہو گئے۔ پھر بھی میری بچی کی زندگی میں بہار نہ آئی۔ اب وہ بیوگی کے دن کس طرح گزارے گی —— ہائے میری بچی۔" وہ تڑپ کر روئی تو بانو بھی اس کی آواز میں آواز ملانے لگی —— "صبر کرو۔ صبر کرو۔ رونے کو ساری زندگی پڑی ہے۔" بوڑھی عورت نے سوتے سوتے چونک کر تسلی دی اور پھر اونگھنے لگی۔ دوسری عورتیں بھی سوتے سے اٹھ پڑیں اور بیٹھ کر جماہیاں لینے لگیں۔

"بہن، بانو اور بچوں کی فکر نہ کرو، میں انہیں اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گا۔ میری زندگی میں انہیں کوئی دکھ نہ ہو گا۔" بوڑھے خسر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا آپ کو سلامت رکھے بھائی صاحب، آپ اس بڑھاپے میں کیا کریں گے؟ اب تو آپ کی خدمت کا وقت ہے —— کیا ہو گا میرے اللہ؟" بانو کی ماں نے سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بوڑھے خسر نے بڑی بے بسی سے اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں کو جھٹکا۔ وہ تو خود ہی ایک بوجھ تھا جسے اس کا بیٹا ڈھو رہا تھا۔ ساری زندگی نوکری کر کے، بیوی بچے اور بوڑھے ماں باپ کا پیٹ پالا، موت سے بدتر بڑھاپے میں نہ کوئی پنشن تھی نہ جمع جتھہ۔ بیٹا کمانے کے لائق ہوا تو اپنی بیتی ہوئی زندگی کا عکس اس کو سونپ دیا۔ اسی طرح ایک سے شب و روز اپنے آپ کو دہراتے چلے آ رہے تھے۔ بھلا اب وہ چار چار جانوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر سہار سکتا تھا؟ اس نے اپنی بیوی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے بانو کی ماں کے سوال کا جواب پوچھ رہا ہو۔

"بہن! بانو اور بچوں کو پالنا ہماری ذمہ داری ہے، تم کیوں فکر کرتی ہو!" ساس نے آہستہ سے جواب دیا اور پھر اپنے بیٹے کو دیکھنے لگیں۔ ابھی میت نہ اٹھی تھی اور زندگی کے مسائل اٹھ پڑے تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ بانو باپ دادا کے جس مکان کو بیچنے کے لئے اودھم ڈھائے رکھتی تھی آج وہی کام آئے گا۔ مکان کا آدھا حصہ کرائے پر اٹھا دے گی تو روکھی سوکھی کھا کر گزارہ ہو جائے گا، پوتا بھی تعلیم پا لے گا۔ اگر مکان بک جاتا تو آج کیا ہوتا۔ بھوکے تو سب سے زیادہ بے عزت ہوتے ہیں۔ اسے یاد آیا کہ بانو کے لڑائی جھگڑے سے تنگ آکر ایک بار اس نے یہی سوچا تھا کہ آدھا مکان کرائے پر اٹھا کر اپنا میاں بیوی کا خرچ چلا لے گی، مگر اس کا بیٹا راضی نہ ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کے ہوتے مکان کرائے پر اٹھے گا تو دنیا کیا کہے گی، یہی نا کہ بیٹا ماں باپ کی خدمت نہ کر سکا۔ آنسو پونچھ کر اس نے بانو کی طرف دیکھا، اس غریب کو بھی کیا پتہ تھا کہ یہ دن دیکھے گی۔ سارا مان چکنا چور ہو گیا۔ وہ ہولے ہولے بانو کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"میں تو کہتی ہوں کہ بانو اور بچے میرے ہی پاس رہیں، اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر دنیا——"

"امی——!" بانو نے ماں کی پوری بات نہ سنی۔ "میں اپنی ساس سسر کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہ رہوں گی۔ وہ تو منہ موڑ گئے۔ اب ان کی خدمت کون کرے گا، بھوکی مر جاؤں گی کسی کے برتن صاف کر لوں گی مگر انہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"شاباش۔" موٹی بوڑھی عورت نے اونگھتے اونگھتے تحسین کا نعرہ بلند کیا اور پھر اونگھنے لگی۔

"برتن تیرے دشمن دھوئیں۔ تیرا چھ کمروں کا گھر موجود ہے، آدھا کرائے پر اٹھا دوں گا تو پیٹ بھر روٹی مل جائے گی۔ مجھے روکھی سوکھی دے دیجیو، بچوں کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دیجیو۔ شکر ہے کہ مکان کی مرمت کرالی تھی ورنہ اس کھنڈر کو کون کرائے پر لیتا۔ تیرا شوہر اپنی زندگی میں کرائے کی بات نہ سنتا تھا مگر اب کیسا چپ پڑا ہے۔" وہ بڑی نحیف آواز میں رونے لگی۔ اتنا رو چکی تھی کہ

اب تو آواز نکلنا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

"مت رو اماں، تم روؤ گی تو مجھے کون تسلی دے گا اماں؟" بانو ساس کے گلے سے لپٹ گئی اور آنسو پونچھنے لگی۔

"خدا تم کو اور بھائی صاحب کو میری بانو کے سر پر سلامت رکھے، مجھے تو اطمینان ہے کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہوگی مگر برادری کا منہ کون بند کرے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ اپنی اولاد کو نہ سنبھال سکی، بے چارے بوڑھے سسر کے سپرد کردیا۔"

"تو کیا تم مجھ سے میرے لال کی نشانیاں بھی چھین لوگی؟" ساس کے کلیجے پر گھونسہ لگا۔

"خدا نہ کرے بہن، میں ایسی نہیں، اللہ بانو کو آپ کی خدمت کی توفیق دے۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مکان اپنے پوتے کے نام کردو تاکہ میں برادری کے سامنے نظریں چار کرسکوں۔ صبح ساری برادری جمع ہوگی، ہر ایک یہی بات کرے گا۔ میں ان کے منہ تو بند کرسکوں گی۔ یہ تو کہہ سکوں گی کہ بانو کو کسی چیز کی کمی نہیں، بانو کا بیٹا تو محل کا راجہ ہے، انہیں میری مدد کی کیا ضرورت، میں پہلے بھی کیا کرتی تھی، جواب کروں گی۔ میری بیٹی نے اپنے شوہر کے وقت میں بھی رانیوں جیسی زندگی گزاری ہے۔" ٹھنڈی آہ بھر کر وہ غور سے ساس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ جس کے دماغ میں ایسی دھڑاک ہوئی تھی جیسے اس کے گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لئے بند ہوگئے ہوں اور وہ باہر کھڑی صدا لگاتی رہ گئی۔ تو یہ ساری محبت مکان سے ہو رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو پریشان نظروں سے بانو کی ماں کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ساس نے سر جھکا لیا۔ کیسی بھول ہوئی کہ اس نے ماضی کے لڑائی جھگڑوں کو برتنوں کی کھڑاک سمجھ لیا۔ یہ مکان ہی تو تھا جو پہلے بھی ماں بیٹی کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ اسی مکان کی مرمت کے لئے اس نے قرض لیا تھا، یہی قرض ادا کرنے کے لئے اس کا بیٹا اسے پچاس روپے مہینہ دیتا تھا۔ مگر بانو نے کبھی یقین نہ کیا کہ یہ روپے قرض میں جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ فساد کرتی کہ اگر اس کے شوہر کے روپوں سے مکان کا قرض ادا ہو رہا

تھا تو پھر اس مکان پر اس کا حق ہے' وہ اسے بیچ دے گی۔ اسے ملبے کا ڈھیر بنا دے گی۔

"امی' گھر چاہے میرے بیٹے کے نام رہے یا سسر کے' کیا فرق پڑتا ہے' مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ برادری کے طعنے سن لیجئے گا' مجھے برادری کی کوئی پرواہ نہیں۔" بانو نے سوچتی ہوئی ساس کو غور سے دیکھ کر بڑے جوش سے کہا اور پھر ماں کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں سے جانے کیا کچھ جھانک رہا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اماں کہیں معاملہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔ دو ننھے ننھے بچوں کے ساتھ اس کی پہاڑ جیسی زندگی گزرنے کو باقی ہے۔

"ہاں بیٹی' تجھے برادری کی کیا پرواہ' تجھے میرے دکھ سے کیا واسطہ —— تو تو آرام سے اپنی ساس کے کلیجے سے لگ کر بیٹھ جائے گی' برادری والے صرف مجھے نہ جینے دیں گے' جدھر جاؤں گی انگلیاں اٹھائیں گے کہ دیکھو کیسی ماں ہے —— کیوں بہن میں غلط کہتی ہوں؟" وہ بانو کی ساس کے قریب سرک آئی۔

"نہیں!" ساس جیسے کنوئیں سے بولی۔ اس وقت اسے گزری ہوئی صبح یاد آ رہی تھی۔ جب وہ اسپتال اپنے بیٹے کو دیکھنے جانا چاہتی تھی مگر اسے سو سو باتیں پکڑا کر ٹال دیا گیا۔

"تم کو برادری کی پرواہ نہیں مگر برادری کو تو تمہاری پرواہ ہے' وہ تو ضرور باتیں بنائے گی۔ ساس سسر کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ ہر ایک اپنا اطمینان کرانا چاہے گا۔ اب کسی کو کیسے یقین آئے گا کہ تیری ساس سسر لاکھوں میں ایک ہیں۔ یہ کام برادری کے سامنے ہو جائے تو تیری ماں کی جان بھی بچی رہے گی۔" موٹی بوڑھی عورت اس طرح دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی جیسے کوئی معرکہ سر کرنے والی ہو۔

"سچ کہتی ہو خالہ' اس رشتے کی سچائی پر کوئی مشکل ہی سے یقین کرتا ہے' اب لوگوں کو یقین دلانے کے لئے تو یہی ہو سکتا ہے کہ مکان پوتے کے نام ہو جائے۔ پھر سب کی زبانیں بند ہو جائیں گی اور ساس سسر کا مرتبہ بھی بلند ہو جائے گا۔" ایک رشتے دار عورت نے ہاں میں ہاں ملائی۔

ساس نے ایک بار سب کی طرف حسرت سے دیکھا۔ ارے ابھی تو اس کے بیٹے کی میت بھی نہیں اٹھی۔ اسے تو آخری منزل پر پہنچا لینے دو، کہیں اس کی روح نہ بے چین ہو رہی ہو۔ اس کی روح کو تو عذاب نہ پہنچاؤ، ابھی سب چپ رہو، پھر مکان تو مکان ہے اس کی کھال بھی کھینچ لینا، سب سے بڑی دولت گنوا بیٹھی مکان کیا چیز ہے۔

"یہ کام تو دنیا کو دکھانے کے لئے ہوگا۔ وہی مثل ہوگی کہ گھی کہاں گیا، کھچڑی میں۔ کھچڑی کہاں گئی، پیاروں کے کلیجے میں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں بہن؟" دوسری عورت نے داد طلب نظروں سے ساس کی طرف دیکھا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔" ساس نے مری سی آواز میں جواب دیا۔ "مگر میرے بیٹے کی میت ——" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"خدا جنت نصیب کرے میری ساس بھی بالکل بانو کی ساس کی طرح تھیں۔ ماں سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ اپنی زندگی میں مکان اور زمین سب میرے بڑے لڑکے کے نام کر دیا تھا۔ میں نے لاکھ منع کیا کہ یہ مت کرو کہیں بن باپ کا بچہ بگڑ نہ جائے، آوارہ نہ ہو جائے مگر میری ایک بات نہ مانی۔ اب وہ نہیں تو جیسے میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ انہیں دیکھ کر شوہر کا غم بھولی تھی۔" تیسری عورت نے آنسو پونچھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔

"یہ بے چاری تو ساس کی موت کے غم میں مہینوں پلنگ سے لگی رہی۔ اب بھی اٹھتے بیٹھتے ہائے کرتی ہے۔" چوتھی عورت نے گواہی دی۔

بانو سب کی بات سنتے سنتے جیسے چونک پڑی اور سرک کر اپنی ساس کے سینے پر سر رکھ دیا اور ساس کا جی چاہا کہ وہ اپنے سینے پر رکھے ہوئے سر کو نوچ کر دور پھینک دے۔

"جب بھائی صاحب بیمار پڑ کر یہاں آئے تھے تو بانو کو ہر وقت یہی فکر رہتی تھی کہ جانے میری ساس سسر کس طرح گزارا کر رہے ہوں گے۔ ہم سب سمجھاتے مگر اس کا فکر سے برا حال رہتا۔" بانو کی خالہ زاد بہن بھی آخر بول ہی پڑی اور بانو نے سر اٹھا کر یوں دیکھا جیسے وہ حرف بہ حرف سچ کہہ رہی ہوں

"ایسی نیک اور محبت کرنے والی ساس سسر کو بھلا کون نہ پیار کرے گا' اب دیکھ لونا بہن' اپنا دکھ بھول کر کس طرح بہو کو کلیجے سے لگائے بیٹھی ہے۔" بوڑھی موٹی عورت نے کہا اور زور سے جماہی لینے لگی۔

ساس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر سب کو بتائے کہ اس نے جس کلیجے سے بانو کو لگایا ہے وہ اسی کو نوچ رہی ہے۔ وہ اپنا گھر اپنی زندگی میں کسی کو بھی نہ دے گی۔ سب کو اس کی اور اس کے شوہر کی موت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ جی چاہنے کے باوجود بھی یہ سب کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ لوگ کیا کہیں گے' یہی نا کہ بیٹے کے ننھے ننھے بچوں اور بیوہ کو ٹھوکر ماری۔ وہ اپنے بیٹے کی نشانیوں کو کلیجے سے نہ لگا سکی۔ سب اس رشتے پر لعنت بھیجیں گے' وہ سر جھکائے سوچتی چلی گئی۔

کلاک نے ڈھائی بجائے۔ اب سردی بڑے غضب دکھا رہی تھی۔ عورتوں نے ایک بار پھر اچھی طرح لحاف اوڑھ لئے اور چند منٹ کے لئے خاموشی چھا گئی' عورت نے اونگھنا شروع کر دیا۔

"بیٹی تم سوئم کہاں کرو گی؟" بانو کی ماں نے خاموشی کو اس طرح توڑا جیسے بات ادھوری رہ گئی ہو۔

"امی میں کل شام کی گاڑی سے چلی جاؤں گی۔ وہیں سوئم کروں گی اور اسی کمرے میں عدت کے دن گزاروں گی جہاں بیاہ کر گئی تھی۔ کیوں اماں؟ بانو نے رو کر پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" ساس نے آہستہ سے جواب دیا۔ جتنی جلدی یہاں سے چلی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ جلدی میں مکان کا قضیہ تو ٹل ہی جائے گا۔

"تو پھر تم صبح قبرستان سے آتے ہوئے کسی وکیل سے کاغذ لکھاتے لانا۔" بانو کی ماں اپنے شوہر سے مخاطب ہو گئی۔ "برادری کے سامنے یہ کام کر کے فرصت کر دی جائے۔ ہائے۔ میرا لالوں کا لال چلا گیا۔ مگر دنیا کے کام نہ بند ہوئے۔" وہ ایک دم سینہ پیٹ کر زور سے رونے لگی تو بانو نے بھی اس کا ساتھ دیا مگر ساس گم سم بیٹھی رہی۔ اسے اب کسی کے رونے کی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ اسے تو بس یہ لگ رہا تھا کہ ایک رعشہ زدہ ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا ہوا ہے اور ایک

صدا اس کے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ بوڑھے محتاجوں کو کچھ اللہ واسطے دے دو۔ اس نے گھبرا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا جس کا سر جھک کر سینے سے لگا ہوا تھا اور زانو پر پڑے ہوئے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

ایک عورت نے اٹھ کر بانو اور اس کی ماں کو بڑی مشکل سے چپ کرایا اور پھر لحاف میں گھس گئی۔ رونے کے بعد کا سناٹا چھا گیا تو عورتیں پھر اونگھنے لگیں۔

کلاک نے تین بجائے تو ساری عورتیں سو چکی تھیں۔ بانو کی ماں بستروں سے دو تکیے نکال لائی اور زبردستی بانو اور اس کی ساس کی کمر سے لگا دیئے۔ ”یہ تو ساری زندگی کا دکھ ہے‘ ایک ذرا کمر ٹیک لو۔ کل سفر بھی کرنا ہے۔ کہیں بیمار نہ ہو جاؤ بہن!“

بانو اور اس کی ساس کو دیوار کے سہارے لگے ہوئے تکیوں سے ٹکا کر وہ خود بھی پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی اور دیکھتے دیکھتے سو گئی۔ بانو کا باپ کمبل میں لپٹا اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کا سر سینے کی طرف جھک گیا تھا اور گلے سے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔

ساس نے بانو کی طرف دیکھا جو بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کھول کر جاگنے کی کوشش کر رہی تھی مگر چند ہی منٹوں میں اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ اب صرف ساس اور سسر جاگ رہے تھے اور پیلی پیلی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھتے۔ پھر ان کی نظریں میت پر جم جاتیں۔ اس وقت گھڑی کی سوئیوں کی رفتار اور ٹک ٹک کی آواز کتنی تیز ہو گئی تھی۔

ساس نے بے خبر سوئی ہوئی بانو کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر کیسا سکون نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑائی۔ سب سو رہے ہیں۔ سب اسے لوٹنے کی خوشی میں سو رہے ہیں۔ صبح وہ بے گھر ہو جائے گی پھر زندگی کس طرح گزرے گی۔ مفلس بڑھاپا تو سب کے لئے لعنت ہوتا ہے۔ اس لعنت کو کون گلے لگائے گا۔ موت کے ہاتھوں بیٹا جدا ہو گیا۔ دنیا اسے بے گھر کر دے گی۔

وہ آہستہ آہستہ بیٹے کی کھاٹ کی طرف سرک گئی اور اس کی سرد پیشانی کو چوم کر اس طرح اس کے سینے پر بانہیں پھیلا دیں جیسے اسے اپنی آغوش میں لے رہی

ہو۔ پھر وہ اتنے ہولے ہولے سسکنے لگی کہ کہیں کوئی سن نہ لے۔ اس وقت تو کوئی اس کے اور بیٹے کی محبت کے درمیان حائل نہ ہو——اس وقت اسے عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ وہ جیسے ساری دنیا سے غافل ہو کر بیٹے کے سینے میں محفوظ ہو گئی ہو۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یوں ہی پڑے پڑے دم نکل جائے۔ وہ اپنے جیتے جی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے لال کو اٹھتے نہ دیکھے۔

ایک رعشہ زدہ ہاتھ اس کے شانے پر کپکپایا اور اسے بیٹے کے سینے سے جدا کر دیا۔ ''صبر کرو' صبر کرو' اب وہ نہ آئے گا۔'' اس کے پاس کھڑے ہوئے شوہر نے سرگوشی میں کہا۔ پھر وہ اسے تھام کر سوئی ہوئی عورتوں کے درمیان سے دبے قدموں گزرنے لگا۔

گلی کے دو منزلہ مکانوں کے ڈربوں میں بند مرغے پر جھاڑ کر بانگیں دے رہے تھے اور مسجدوں سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس وقت ایک تانگہ اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا اور کمبلوں میں لپٹے ہوئے میاں بیوی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے' آنسوؤں کی دھند کے پار اس دور ہوتی ہوئی گلی کو دیکھ رہے تھے جہاں وہ ایک کمرے میں اپنے بیٹے کی لاش چھوڑ آئے تھے۔

# ٹھنڈا میٹھا پانی

اب جنگ ختم ہو چکی ہے۔ جگہ جگہ پر کھدی ہوئی حفاظتی خندقیں پٹ چکی ہیں۔ جن لوگوں کے گھر توپ کے گولوں سے ملبے میں تبدیل ہو چکے تھے' ان گھروں کو پھر سے آباد کیا جا رہا ہے۔ فائر بندی ہوئے بھی عرصہ گزر گیا۔ جب جنگ شروع ہوئی تھی تو خزاں کا موسم تھا' پھر سردی پڑی اور اب بہار آئی ہوئی ہے۔ اب لوگ اسی طرح مصروف اور خوش نظر آتے ہیں جیسے جنگ سے پہلے تھے۔ مندے کاروبار پھر سے چمک اٹھے ہیں۔ پتہ نہیں کہ چھ سات مہینے گزرنے کے بعد لوگوں کو اب وہ جنگ کے زمانے کی اذیتیں یاد بھی ہوں گی کہ نہیں۔ دنیا کی ہما ہمی بڑی جلدی سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ مگر میں دوسروں کی بات کیا کروں۔ اپنی کہتی ہوں کہ اب بھی جب کبھی کبھار رات کو میں چاندنی کو زمین پر لوٹتی دیکھتی ہوں تو مجھے پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ چاند آج بھی اپنے پڑوسی ملک کی شکایت کر رہا ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ چاند نہ کچھ کہتا ہے نہ سنتا ہے' یہ سب شاعروں اور ادیبوں کی باتیں ہیں تو ٹھیک ہے۔ ایسی باتیں سوچنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں افسانہ نگار ہوں' چاند کے لئے میرے عجیب سے احساسات ہیں۔ جب میں نے سنا تھا کہ روسی لونا نمبر 9 چاند پر اتر گیا تو انسانی ذہن کی رسائی نے میرے دل میں انسان کی اور بھی عزت پیدا کر دی تھی' مگر میرے دل کے ایک گوشے سے ہوک بھی اٹھی تھی۔ میں نے ایک بار چاند کو غور سے دیکھا تھا تو یقین جانیے کہ میری ان اتنی کمزور آنکھوں نے چاند پر روسی جھنڈا اگڑا دیکھ لیا تھا۔ میں نے چاند پر چرخا کاتتی ہوئی بڑھیا کی لاش تک دیکھ لی تھی۔ لونا نے اس کا چرخا توڑ دیا تھا۔

پتہ نہیں چاند پر انسان کی فتح کے بعد کیا ہوگا۔ کتنا فائدہ پہنچے گا اور کتنا

نقصان، مگر ابھی تو مجھے صرف یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان زمین کے باسیوں سے کچھ چھن گیا ہے۔ مجھے تو اب چاند کو دیکھ کر کسی حسین تصور کو ذہن میں لاتے بھی بوکھلاہٹ ہوتی ہے۔ میرے تصور کی دنیا میں اب عشق و محبت کے اس سنہرے گولے سے چھنتی ہوئی چاندنی میں کوئی اپنے محبوب کی یاد میں روتا نظر نہیں آتا۔ جب میں یہ سب کچھ دیکھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کرتی ہوں تو مجھے خیال آنے لگتا ہے کہ جانے چاند پر کون کون سی دھاتیں ہوں گی اور جانے ان دھاتوں سے انسان کی آبادی اور بربادی کے کون کون سے باب لکھے جائیں گے۔ جانے کب یہ چاند بھی جنگ کا میدان بن جائے۔

ابھی ابھی چاند کے تصور پر چھائے ہوئے اندھیرے میں بھٹک رہی تھی کہ سرشام چمکنے والے تارے زہرہ پر بھی روسی جھنڈا گڑ گیا۔ اب میں کسی کی چمکتی ہوئی روشن آنکھیں دیکھ کر کیسے کہوں گی کہ ان میں تارے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ اب میں کیسے کہوں کہ لوگو! جب تم دنیا کی مصیبتیں جھیل جھیل کر تھک جاؤ گے تو تمہارے لئے کوئی حسین تصور باقی نہیں رہ جائے گا۔ تم چاندنی میں بیٹھ کر ذکر محبوب کے بجائے چاند پر پائی جانے والی دھاتوں کی بات کرو گے اور راتوں کو جب تمہیں اپنے محبوب کا فراق ستائے گا تو تم تارے گننے کے بجائے زہرہ پر بنگلہ بنانے کی سوچو گے۔

ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی اور بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں کہہ رہی تھی کہ مجھے آج تک چاند شا کی نظر آتا ہے۔ آج بھی جب کسی آس پاس کے گھر میں شادی پر گولے چھوڑے جاتے ہیں تو مجھے توپوں کی گرج اور بموں کے دھماکے یاد آجاتے ہیں۔ آج بھی جب میں کسی وقت باورچی خانے میں جانکلتی ہوں تو کھونٹی پر لٹکی ہوئی لالٹین کو دیکھ کر مجھے سترہ راتوں کے اندھیرے یاد آجاتے ہیں۔ اسی لالٹین کی مدھم لو کے سہارے ہم ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے، چلتے پھرتے ہوئے، میزوں، کرسیوں اور پلنگوں سے ٹکراتے کئی دفعہ گھٹنے پھوٹے، انگلیوں سے خون بہا۔ اس لالٹین کی چمنی آج تک کسی نے صاف نہیں کی۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے کبھی صاف نہ کیا جائے تاکہ میں یاد رکھوں کہ جنگ کے دنوں

کی راتیں سیاہ ہوتی ہیں۔

مجھے امن سے محبت ہے۔ مجھے جنگ سے نفرت ہے، مگر مجھے اس جنگ سے بھی امن کی طرح محبت ہے جو انسان اپنی آزادی، اپنی عزت اور ملک کی بقا کے لئے لڑتا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ جنگ ختم ہو گئی ہے مگر میں جب تک زندہ ہوں میری یادیں ختم نہ ہوں گی۔ اب میں آٹھ دس سال کے بچے کو کیسے بھولوں جو جنگ کے زمانے میں میرے قریب کے گھر کی چھت پر کھڑا پتنگ اڑا رہا تھا۔ اس دن اتنے جہاز اڑ رہے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ یہ اپنے جہاز ہیں میرا دل خوف و دہشت سے لرز رہا تھا۔ میں نے چیخ کر لڑکے سے کہا کہ "چھت سے اتر جاؤ۔" وہ کہنے لگا۔ "دشمن کے جہاز آئے تو اس پتنگ سے گرا لوں گا۔ میں آپ کی طرح ڈرتا نہیں۔"

ایک لمحے کو میں نے اپنے دھڑکتے اور لرزتے دل کو ٹھہرا ہوا پایا۔ مگر دوسرے ہی لمحے جب ایک اور طیارہ گزرنے لگا تو سائرن کی خوفناک آواز گونجی تو میں دہشت کے مارے چیخ چیخ کر پرویز، اپنے بیٹے کو پکارنے لگی۔ وہ جانے کدھر چلا گیا تھا۔ اسے پکارتے پکارتے میں گھر میں رہی کہ کہیں کرن نہ ڈر رہی ہو۔ شکر ہے کہ پرویز دوسرے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ وہ کتابیں چھوڑ کر آپ ہی میرے پاس آ گیا تھا۔ ان دنوں جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ ہر وقت بچوں کو نظروں میں رکھتی۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ سینہ چیر کر انہیں چھپا لوں۔ جنگ کی کوئی پرچھائیں ان پر نہ پڑنے پائے۔ ایک فلم میں دیکھا ہوا وہ سین بار بار میری نظروں میں گھوم جاتا جس میں بمباری کے بعد بکھری ہوئی لاشیں دکھائی گئی تھیں اور ان لاشوں کے بیچ میں ایک ننھا سا بچہ رو رو کر جانے کسے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ مگر اس وقت جب میں کرن اور پرویز کو اپنے پاس بٹھائے ہوئے تھی تو جانے کیوں مجھے ان کی حفاظت کرنے کا کوئی جذبہ ستا رہا تھا۔ مجھے برابر وہ پتنگ اڑانے والا بچہ یاد آ رہا تھا۔ کیا وہ اب بھی پتنگ اڑا رہا ہو گا۔ اللہ یہ آزادی کا جذبہ کیا چیز ہے، جسے آج تک کوئی طاقت فتح نہیں کر سکی اور کیا یہ جذبہ اتنی ننھی ننھی جانوں کی روحوں میں بھی حلول

کر جاتا ہے! پتہ نہیں بڑے بڑے ملکوں کے حکمران بھی کبھی اسی طرح سوچتے ہوں گے کہ نہیں۔ وہ تو یہی سمجھتے ہوں گے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو نگل سکتی ہے۔ انسانوں اور مچھلیوں میں بھلا انہیں کیا فرق لگتا ہوگا' حالانکہ ویت نام نے ساری دنیا میں ڈھنڈورا پٹوا دیا ہے کہ یہ تالابوں اور سمندروں سے نکلی ہوئی ضرب المثل کام نہ آئے گی۔

جنگ کو صرف چند ہی دن گزرے تھے تو ظہیر نے فیصلہ کیا کہ بچوں کو لاہور سے ہٹا دیا جائے تاکہ وہ رات دن کے خوف ناک دھماکوں سے خائف نہ ہوں۔ میں نے سخت احتجاج کیا کیونکہ میں اپنے سارے پیاروں کو چھوڑ کر دور نہیں جانا چاہتی تھی مگر کرن' میری بیٹی کی سہمی ہوئی آنکھوں نے مجھے مجبور کردیا کہ اس ننھی سی جان کو یہاں سے لے جانا ضروری ہے۔ دوسرے دن میں اور دونوں بچے بذریعہ کار ملتان روانہ ہوگئے۔ لاہور کی سرزمین کو میں نے کس طرح کلیجے سے لگا کر رخصت کیا' یہ صرف میں جانتی ہوں۔ میں اس وقت کتنی جذباتی ہو رہی تھی' شاید میں روئی بھی تھی۔ راستہ کس خرابی سے گزر رہا تھا۔ میں ساری کے پلو میں منہ چھپائے نڈھال سی پڑی تھی۔ ایک جگہ کار جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور جب دیر تک نہ چلی تو میں نے سر اٹھا کر باہر دیکھا۔ فوجیوں سے بھری ہوئی گاڑیاں قطار سے کھڑی تھیں اور سڑک کی خرابی کی وجہ سے ایک ایک کرکے آہستہ آہستہ گزر رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ جانے یہ سب کس محاذ پر جا رہے ہوں گے اور ان میں کتنے واپس آئیں گے۔ میں نے دل ہی دل میں انہیں الوداع کہی اور پھر منہ چھپا لیا لیکن دوسرے ہی لمحے تالیوں کی آواز نے مجھے ان کی طرف متوجہ کر دیا۔ سب سے پچھلی گاڑی میں کھڑے ہوئے فوجی بھنگڑا ناچ رہے تھے۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے ساری گاڑیوں میں بھنگڑا شروع ہوگیا۔ وہ زور زور سے ہنس رہے تھے۔ کچھ کے ہونٹوں میں سگرٹیں دبی ہوئی تھیں۔ ان کی تالیوں میں اتنا جوش تھا کہ خدا کی پناہ! میں انہیں دیکھ رہی تھی مگر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ یا اللہ کیا سچ مچ یہ توپوں اور گولیوں کا مقابلہ کرنے جا رہے ہیں! میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کے چہرے تک رہی تھی۔ سچ کہتی ہوں ان چہروں پر فکر کی ذرا سی دھول نہ تھی' ان

چہروں پر پھول کھل رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ لاہور اور میرے عزیز مجھ سے جدا نہیں ہوئے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کود کر کار سے نکل بھاگوں اور ان کے ساتھ ناچنے لگوں اور اگر ناچ بھی نہ سکوں تو چیخ چیخ کر ساری دنیا میں اپنی آواز پہنچا دوں کہ یہ ناچ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

پھر وہ فوجیوں سے بھری ہوئی گاڑیاں آگے بڑھ گئیں مگر میں انہیں حد نظر تک دیکھتی رہی' ان کی تالیوں کی آواز سنتی رہی۔ اپنے آپ سے پوچھتی رہی کہ کیا میں موت سے ڈرتی ہوں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے موت شہد کا گھونٹ محسوس ہو رہی تھی۔

جنگ کے دنوں میں کیسی اچاٹ سی نیند آتی تھی۔ ملتان کی دوسری رات تھی۔ ہمارے میزبان اور سب بچے سو رہے تھے تو میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ہوائی جہازوں کی تیز گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو دور آسمان پر سرخ روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ میزبان کو جگا دوں اور ان سے پوچھوں کہ یہ سب کیا ہے کہ اتنے میں ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ کھڑکیوں کے شیشے جھنجھنائے اور درودیوار اس طرح ہلے جیسے سر پر آ گریں گے۔ اب کچھ معلوم کرنا بے کار تھا۔ سب لوگ جاگ کر ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ میرے بچے پکار رہے تھے۔ میں نے جلدی سے سب کو مشورہ دیا کہ بیچ کی گیلری میں میزوں کے نیچے بیٹھ جاؤ۔

پھر ایک اور دھماکہ ہوا جو پہلے سے شدید تھا۔ میزوں کے نیچے بیٹھے ہوئے بچے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ میں نے کرن کو اپنے قریب کر کے لپٹا لیا اور پرویز کے کان میں چپکے سے کہا کہ "موت سے نہیں ڈرتے۔ تمہیں تو وہ بھنگڑا ناچتے فوجی یاد ہیں نا؟" وہ ہنسا اور ڈٹ کر بیٹھ گیا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہا ہے۔ چند لمحوں بعد پھر لگاتار دو دھماکے ہوئے مگر وہ شدید نہیں تھے' دور کی آواز تھی۔ پھر فوراً" ہی ایک جہاز مکان کی چھت سے گزرتا ہوا معلوم ہوا۔ مجھے ایک لمحے کو سارے بچھڑے ہوئے عزیز یاد آ گئے۔ مجھ پر سخت مایوسی کا غلبہ ہوا۔ اپنوں

سے دور پردیس میں مر جانا کتنا حسرتناک ہوتا ہے۔ میں نے تصور کی دنیا میں سب کو ایک بار دیکھا مگر پلک جھپکتے وہ سب غائب ہو گئے۔ دو جہاز ایک ساتھ چھت پر سے گزر رہے تھے۔ میں نے خدا کو یاد کیا۔ اس کٹھن وقت کے گزر جانے کی دعا کی اور مجھے بڑا سکون ملا۔

جہاز کی آواز لمحوں کے اندر دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ پھر دیر تک نہ کوئی دھماکہ ہوا اور نہ کوئی جہاز گزرا۔ مکمل خاموشی طاری تھی۔ بس کسی کسی وقت ساتھ کے مکان سے کتے کے بھونکنے کی اور رونے کی آواز آرہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کلیئر کا سائرن ہوا تو ہم سب اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میری میزبان خاتون جو پورے وقت اپنے تین سالہ بچے پر جھکی بیٹھی رہی تھیں۔ پہلی بار بولیں۔ ”آپا جی' بچے کتنے پیارے ہوتے ہیں اگر دھماکے سے چھت گرتی تو پہلے مجھ پر آتی' منا تو میرے نیچے چھپ کر بالکل محفوظ رہتا نا۔“ اور پھر وہ میرا جواب سنے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

بچے جلد ہی سو گئے مگر میں ساری رات جاگتی رہی۔ مجھے برابر یہ خیال آرہا تھا کہ جس جگہ بم پھٹے ہوں گے وہاں کا کیا نقشہ ہو گا۔ وہاں معصوم بچوں اور عورتوں پر کیا گزری ہو گی۔ میں نے یہ سوچ کر کتنی ہی بار اپنے سوئے ہوئے بچوں کو زور زور سے لپٹایا۔ مجھے اندھیرے میں بیشمار بچوں کی لاشیں نظر آرہی تھیں۔ مجھے زخمی بچے تڑپتے دکھائی دے رہے تھے۔

رات تڑپا کر گزر گئی۔ صبح تڑکے میں اپنے میزبان کے ساتھ ان جگہوں پر جانے کے لئے تیار ہو گئی جہاں بم گرے تھے۔

ملتان سے دو تین میل دور جب رکے تو وہاں لوگوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں بہت سے کچے مکان اور جھونپڑے بکھرے پڑے تھے۔ عورتیں جھونپڑوں تلے دبے ہوئے سامان کو نکال رہی تھیں۔ ہر طرف برتن لڑھک رہے تھے۔

بچے بے حد سہمے نظر آرہے تھے۔ کئی بچوں کے سروں اور پیروں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کچھ عورتیں یوں ہاتھ دھرے بیٹھی گرے ہوئے جھونپڑوں کو

دیکھ رہی تھیں جیسے سب کچھ لٹ گیا ہو۔ ان کے یہ جھونپڑے نہیں محل تھے جو ڈھے گئے۔ مرد آئے ہوئے لوگوں کو بتا رہے تھے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

میں بے چینی کے ساتھ کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس اتنے بڑے ہجوم کے باوجود مجھے ویرانی لگ رہی تھی۔ پھر بھی یہ سن کر کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ مجھے بڑا اطمینان ہو گیا۔

میں جہاں کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس سے کوئی ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر بہت سے آدمی کھڑے تھے اور جھک جھک کر نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے۔ چپراسی نے پوچھنے کے بعد بتایا کہ اس جگہ بم گرا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب لوگ وہاں سے ہٹ گئے تو میں بھی وہاں تک پہنچ گئی۔ بم گرنے کی جگہ پر ایک چھوٹا سا کنواں بن گیا تھا اور اس کنوئیں کے قریب ایک بوڑھا شخص سفید چادر بچھائے ہوئے بیٹھا تھا۔ چادر پر بے شمار سکے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بوڑھے نے آواز لگائی: "چندہ دو بیگم صاحب' اس جگہ کنواں کھدے گا اور یہاں سے ٹھنڈا میٹھا پانی نکلے گا۔"

میرے پرس میں جو کچھ تھا وہ چادر پر ڈال دیا تو بوڑھا جیسے ترنگ میں آ کر زور زور سے آوازیں دینے لگا:

"ٹھنڈا میٹھا پانی سائیں ٹھنڈا میٹھا پانی!"

# بھروسا

سارا جون بارش کے ایک قطرے کے بغیر گزر گیا تھا مگر آج صبح بڑے زور کی آندھی چلی اور پھر ایسی بارش ہوئی کہ جل تھل کر گئی۔ احاطے کے بچوں نے کپڑے اتار کر پانی میں چھپا چھپ شروع کر دی۔ جسموں پر جما ہوا میل پھول گیا تھا۔ جون کی گرمی میں پھکتے ہوئے جسم ٹھنڈی کیچڑ میں لوٹنی لگا رہے تھے۔

بارش رکی تو عورتیں بالٹیاں اور گھڑے اٹھا کر ہینڈ پمپ کی طرف لپکیں۔ صبح سے سارا کام رکا پڑا تھا۔ وہ سب جلدی میں تھیں اور ہر ایک یہی چاہ رہی تھی کہ پہلے وہ پانی بھرے۔ کئی کئی بالٹیاں اور گھڑے بیک وقت ہینڈ پمپ کی ٹونٹی سے ٹکرا رہے تھے مگر اس تیزی کے باوجود وہ سب کچی چھتوں کے ٹپکنے، سامان کے بھیگنے اور بارش سے ڈری ہوئی بکریوں کے چیخنے کی باتیں کر رہی تھیں۔ کوارٹروں کی مالکن کی بھی برائیاں ہو رہی تھیں جو کرایہ لینے کے بعد بھی چھتوں پر مٹی نہیں ڈلواتی تھی۔ باتوں کے درمیان جب بچے عورتوں کی طرف کیچڑ اچھال دیتے تو دو چار سڑی سڑی گالیاں بھی ہو جاتیں۔ اور عین اسی وقت جب کہ سب پانی بھرنے اور باتوں میں مصروف تھیں تو رضیہ ریڑھے پر اپنا سامان لادے آ گئی۔ ریڑھے کے پہیے کیچڑ اچھالتے احاطے میں آ کر رک گئے تو سر سے پاؤں تک بھیگی ہوئی رضیہ نے اتر کر سب سے پہلے اپنی بیٹی کو اتارا اور پھر اپنا دوپٹہ نچوڑ کر جلدی سے اوڑھ لیا۔ کوچوان سامان اتارنے لگا تو رضیہ اس کی مدد کرنے لگی۔

پانی بھرنے والیاں اپنی بالٹیاں اور گھڑے ہینڈ پمپ کے پاس چھوڑ کر نئے کرایہ دار کو دیکھنے کے لئے جمع ہو گئیں۔ اس وقت انہیں ذرا بھی جلدی نہ تھی۔

"ہے بہنا۔" رضیہ جلدی سے کہنے لگی۔ "صفدر رات کو آ کر کوارٹر دیکھ گیا

تھا' کہتا تھا کہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ تیرا جی لگا رہے گا۔ اس وقت دہاڑی کرنے گیا ہوا ہے۔ کہتا تھا کہ رات کو آ کر آپ ہی سامان لے جاؤں گا۔ تو مت لے جائیو نہیں تو تھک جائے گی۔ راستے میں تھی کہ بارش آ گئی۔ چلو نہالی۔ اب اگر طبیعت خراب ہوئی تو وہ غصے ہو گا۔" وہ بڑے پیارے پن سے ہنسی —— "غصے ہو گا تو کیا' وہ بھی تو شام تھکا ہوتا ہے۔" رضیہ نے داد طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور پھر اپنی پڑوسنوں سے یوں گلے ملنے لگی جیسے مدتوں سے جانتی ہو۔ "اری بہنا یہ تونے اپنے بچے کا کیا حال بنا رکھا ہے۔ میں بتاؤں تو روز اسے صبح کے وقت ذرا سا مکھن کھلایا کر۔ صفدر اسی طرح کرتا تھا تو میری صفیہ یہ موٹی تھی۔ اسے گود میں اٹھانے پر شرطیں لگا کرتیں۔ سب کی کمر ٹیڑھی ہو جاتی۔"

"اچھا!" شاداں پٹھانی نے رضیہ کے گلے سے الگ ہوتے ہوئے حیرت سے دبلی پتلی صفیہ کو دیکھا جو زمین پر بیٹھی گیلی مٹی کھرچ کھرچ کر ہتھیلیوں سے سویاں بٹ رہی تھی۔ شاداں نے اطمینان کی سانس لے کر اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور پشتو زبان میں رضیہ کو ایک موٹی سی گالی دے کر ہنسنے لگی۔ پندرہ سال سے غریب لاہور ہی میں رہ رہی تھی۔ دوسروں نے تو اس کی زبان سیکھ کر نہ دی مگر وہ اب اکھڑی اکھڑی اردو اور پنجابی بولنا سیکھ گئی تھی۔ اپنی زبان تو اب صرف دل کا غبار نکالنے کے لئے ہی بولا کرتی۔

"پر ماسی تیری کمر تو اب تک سیدھی ہے۔" پیلو نے ہنس کر کہا اور پھر سب زور سے ہنس پڑے۔ پیلو بے چاری کو یوں تو کوئی مشکل ہی سے منہ لگاتا مگر وہ ہنس بول کر آپ ہی سب کے منہ لگ جاتی۔ عیسائی ہونے کی وجہ سے اسے سب ہیٹا سمجھتے۔ اس پر ستم یہ کہ اس کا ابا سڑکوں پر جھاڑو دینے کا کام کرتا تھا۔

"اری تو کوئی ہمیشہ کے لئے کمر تھوڑی ٹیڑھی ہو جاتی تھی۔" رضیہ نے ذرا بگڑ کر جواب دیا اور کوٹھری کا تالا کھول کر سامان میں بندھی ہوئی جھاڑو نکالنے لگی۔ "صفدر کے لئے کھانا بھی پکانا ہے بہنا' ابھی پکا لوں گی۔ نہیں تو پھر آ کر کام نہ کرنے دے گا۔ کہے گا تو تھک گئی ہو گی سامان باندھ باندھ کر۔"

شاید اس کی بات کسی نے سنی ہی نہیں کیونکہ سب کی نظریں اس کے سامان

کو ٹٹول رہی تھیں۔ موٹے موٹے پایوں والی بے ڈھنگی سی مسہری۔ نیا چمکتا ہوا ٹرانزسٹر۔ دو بکس، سُتلی سے بندھا ہوا بستر، برتنوں کی بوری، ایک میز اور ایک کرسی۔ بانس کی دو کھاٹیں جن کے پرانے بان ٹوٹ کر لٹک رہے تھے۔

ایسے شاندار سامان کو دیکھ دیکھ کر عورتوں کی آنکھیں حیران ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کے کوارٹروں میں تو کھاٹوں، بستروں اور برتنوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

"ریڈیو تو بجا ماسی۔" پیلو نے ہمک کر فرمائش کی۔

"لے میں کیا جانوں بجانا، تیرا بھائی آ کر بجائے گا۔ میں نے تو منع کیا تھا کہ مت خرید مگر زبردستی لے آیا۔ کہ تو گانے سنے گی تو پھر اکیلے میں جی نہ گھبرائے گا۔" رضیہ بڑے غرور سے ہنسی۔ "لو بہنا اب میں کام کروں۔ میری لڑکی بھی بھوکی ہوگی۔ سب سامان بھی رکھنا ہے۔" رضیہ جھاڑو لے کر کوٹھری کے اندھیرے میں ڈوب گئی اور منٹوں میں کوٹھری سے دھول کا بادل اٹھنے لگا۔

عورتیں ہینڈ پمپ کی طرف پلٹ گئیں دن کے کوئی دس گیارہ بج رہے تھے، مگر بادلوں سے لدے پھندے دن نے وقت گزرنے کا احساس ختم کر دیا تھا۔ عورتیں اب بڑی پھرتی سے گھڑے اور بالٹیاں اٹھا اٹھا کر اپنے کوارٹروں میں جا رہی تھیں۔ بس ایک پیلو تھی جو سب کچھ بھول بھال کر ایک ساں ٹرانزسٹر کی باتیں کئے جا رہی تھی۔ اس کے لئے یہ بات کس قدر اچنبھے کی تھی کہ اب وہ اپنے احاطے میں گانے سن سکے گی۔ ویسے تو گانے سننے کے لئے تیری میری کوٹھیوں کے چکر لگانا پڑتے اور شوق کو پورا کرنے کے لئے بیگمات کے بیسیوں کام مفت میں کرنے پڑ جاتے۔

سامان سلیقے سے لگا کر رضیہ نے کوٹھری کے باہر بیٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور پھر پیلے پھولدار دسترخوان میں بندھی ہوئی روٹیاں کھول کر صفیہ کے ساتھ کھانے بیٹھ گئی۔ "تمیز سے کھا۔ گرا نہیں، لوگ کہیں گے کہ چوہڑے چمار کی اولاد ہے۔" اس نے خواہ مخواہ صفیہ کو ڈانٹ دیا اور اس ننھی سی جان پر اس ڈانٹ کا ایسا اثر ہوا کہ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ رضیہ نے بڑی مشکلوں سے اس کو سینے سے لگا لگا کر چپ کرایا اور پھر دل ہی دل میں کوسنے لگی۔ اری اماں، تیری اولاد بھی اللہ

کرے قطرہ قطرہ محبت کو ترسے۔ میرا تو کچھ نہ بگڑا پر تو لونڈیا کو بن باپ کا کر گئی۔
کھانے کے بعد وہ مسہری پر تھکی تھکی سی لیٹ گئی۔ صفیہ کو اپنے پہلو میں لٹا لیا اور ایک بار پھر اسے پیار کرنے لگی۔ مگر صفیہ اس محبت سے اکتا کر ایک سال کسمسائے جا رہی تھی۔ اس کا کیسا جی چاہ رہا تھا کہ باہر نکل کر سب میں شامل ہو جائے۔

"نہیں سونا تو پھر باہر جا کر کھیل آ۔" رضیہ نے بڑے پیار سے کہا۔ صفیہ کو ڈانٹ کر اب تک اس کا دل جل رہا تھا۔ اسے گزرے ہوئے دن یاد آ رہے تھے۔ اگر صفیہ نہ ہوتی تو وہ بھول کر بھی ان دنوں کو یاد نہ کرتی۔ صفدر کے ہوتے آخر اسے کس بات کی کمی ہے۔ صفیہ کو تو وہ اپنی اولاد کی طرح چاہتا ہے۔ رضیہ نے صفیہ کے جانے کے بعد اپنے دل کو تسلی دی۔ اور پھر کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر آج تو صفیہ کو ڈانٹنے کے ساتھ ہی اسے صفیہ کا باپ اور اپنی ماں سب یاد آنے لگے۔ ماضی کی دھول نے اس کی آنکھوں سے نیند اڑا دی تھی۔

اماں باوا کی چھٹی بیٹی اور آخری دسویں اولاد ہونے کی وجہ سے سب نے اس کی پیدائش پر لعنت بھیج دی تھی۔ سب نے اس کی موت کی دعائیں مانگیں مگر وہ بڑی ڈھٹائی سے جیے چلی گئی۔ اماں باوا کے گھر اسے کبھی پیٹ بھر روٹی نہ ملی۔ کبھی کوئی پیار سے نہ بولا۔ جب اماں نے باری باری اپنی پانچوں بیٹیوں کو لوٹا، کٹورا اور ایک ایک جوڑا دے کر دوسرے گھروں میں رخصت کر دیا تو وہ مارے دکھ کے بہت روئی تھی۔ دس سال کی عمر میں اس کی خواہش تھی کہ پہلے اسے رخصت کیا جاتا۔ بڑی بہنیں جب کبھی کبھار مائیکے آتیں تو آپس میں اپنے میاؤں کی محبت کا ذکر کرتی رہتیں۔ ایسی ایسی باتیں بتاتیں کہ رضیہ کے حواس گم ہو جاتے۔ پھر وہ بتاتیں کہ ان کے میاں تو صرف ان کی خاطر ایک وقت گوشت پکواتے ہیں تو وہ بچ بچ چیخ پڑتی۔ گوشت کا ذائقہ اور محبت کی بو سونگھ کر وہ اپنی بہنوں کو گالیاں دینے لگتی۔ "جھوٹیاں حرام زادیاں۔" اسے تو نہ کھانے کو کبھی ایک بوٹی ملتی اور نہ جینے کو محبت۔ بھائی چوٹی پکڑ پکڑ کر مارتے۔ ماں ہر وقت کوستی رہتی کہ کتے بلی کی

آئی ہوئی موت اسے سمیٹ لے جائے۔ گھر سے بھاگ کر وہ پڑوس میں پناہ لیتی۔ اب پڑوس میں کون فالتو تھا جو اس کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ اسے کلیجے سے لگاتا۔ پڑوسنیں اسی وقت پیار سے بولتیں جب انہیں اپنے بچوں کے پوتڑے دھلوانے ہوتے۔ انکار کرتی تو وہ بھی دھکے مار کر نکال دیتیں کہ جا اپنی ماں کے کولہے سے لگ کر بیٹھ۔

چودہ سال کی ہوئی تو اماں نے رو رو کر اور کوس کوس کر لوٹے کٹورے کا انتظام کر کے اپنے حساب اسے دوسرے گھر ڈھکیل دیا۔ مگر رضیہ کو تو جیسے جنت مل گئی۔ شوہر نے اسے بتایا کہ اس کا مکھڑا چاند سا ہے' وہ رضیہ کے قدموں کا غلام ہے۔ اور اگر وہ اس کی محبت سے ہٹ کر چلے تو وہ خدا کا گنہگار ہو۔ ایسی باتیں سن سن کر رضیہ مارے حیرت کے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہ آتا کہ وہ جو چڑیل صورت تھی اس کا چاند سا مکھڑا ہے اور جسے سب نے اپنے قدموں تلے روندا' اس کے قدموں کا بھی کوئی غلام ہو سکتا ہے اور جب اسے ان سب باتوں کا یقین ہو گیا تو اسے ایسا لگا کہ وہ مارے غرور اور خوشی کے ہوا میں اڑ رہی ہے۔ صبح اس نے اپنی نندوں کو بتایا کہ ان کا بھائی اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ پھر بغیر بلوائے وہ اماں کے گھر بھاگی بھاگی گئی اور لہک لہک کر سب کو میاں کی انتہائی محبت کا حال سنایا۔ بہنیں جو اس کی شادی میں شریک ہونے آئی تھیں اور اب ازدواجی زندگی کے کئی سال گزارنے کے بعد باسی دال ہو چکی تھیں' کڑھ کر رہ گئیں۔ مگر رضیہ کی بھاوج نے تو مارے جلن کے اس کے افشاں سے بھرے ہوئے بال ہی کھسوٹ ڈالے۔ وہ روتی سسکتی اور سب پر لعنت بھیجتی اپنے گھر واپس آ گئی۔ رات اس نے رو رو کر اپنے میاں کو حال سنایا۔ تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اسی وقت باہر نکل گیا اور سسرال کے دروازے پر کھڑے ہو کر سب کو بے نقط سنائیں کہ کسی کو بولنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ پھر گھر آ کر رضیہ سے قسم لی کہ اب کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھے گی۔

رضیہ سارا دن میاں کا کلمہ پڑھتی۔ پیروں کا غلام دنیا سے بے خبر تھا۔ اور ساس نندوں کے کلیجے دکھ سے پھٹے جا رہے تھے۔ ماں بیٹے کو چھیننے اور بہنیں بھائی کو

پانے کے لئے ہر وقت چوکس رہنے لگیں۔ ان کی زبانیں دو دو ہاتھ لمبی ہو گئیں۔ مگر جب اس کا شوہر رضیہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھتا تو ماں بہنوں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا اور اس وقت رضیہ کا جی چاہتا کہ اس کی ساس نندوں کی زبانیں اور لمبی ہو جائیں۔ مارے غرور کے رضیہ سیدھی طرح نہ چل سکتی۔

سال مزے سے گزر گیا۔ مگر یوں کب تک ہوتا۔ آخر ماں بہنوں کی بن آئی۔ روز کی کٹ کٹ سے شوہر اکتا گیا تھا۔ اپنے پالنے والی سے کب تک منہ موڑتا۔ آخر یہ بھی تو گناہ تھا۔ ایک دن جو رضیہ نے ساس کی شکایت کی تو اس نے اسے خوب پیٹا۔ پہلے تو رضیہ کو اپنے پٹنے کا یقین ہی نہ آیا۔ مگر جب روز یہی عمل ہونے لگا تو رضیہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے غرور کے پر ٹوٹ گئے۔ وہ ہوا میں اڑتے اڑتے دھم سے نیچے گر گئی۔ وہ سسک سسک کر روئی پیٹی مگر اب اسے کون سینے سے لگاتا۔ انہیں دنوں رضیہ کے پیٹ میں صفیہ کلبلانے لگی اور اس کا شوہر راتوں کو غائب رہنے لگا۔ اس کی ساس نندوں نے اسے نہتا دیکھ کر بڑی محبت سے غمخواری شروع کی۔ رضیہ کے غم میں ساس نندوں نے گھر کے کام سے منہ موڑ لیا اور رضیہ ان کی محبت کی قائل ہو کر سارا دن گھسٹ گھسٹ کر کام کرتی پھری۔ شوہر گھر آتا تو اسے دیکھ کر وہ کونوں کھدروں میں منہ چھپا کر روتی پھرتی۔ کسی کو ہمیشہ کے لئے محبت کے جذبہ سے ناواقف رکھا جائے تو شاید یہ جرم نہیں مگر کسی کو محبت دے کر چھین لینا سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کا رواں رواں چیختا رہا' ارے ظالم مڑ کر تو دیکھ۔

صفیہ کی پیدائش پر تو رضیہ بالکل ہی ویران ہو گئی۔ شاید لڑکے کی پیدائش پر اپنے شوہر کی محبت کو لوٹا سکتی۔ اب تو اس گھر سے اس کا دل بالکل ہی اچاٹ ہو گیا۔ چھلا نہا کر اٹھی تو زیادہ وقت گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر گزار دیتی۔ انہی دنوں صفدر نے اس کے پاس سے گزرنا شروع کیا۔ پھر ہوتے ہوتے اس نے صفیہ کے آنسو پونچھنا شروع کئے اور رضیہ اپنے کو سنبھالنے کے باوجود صفدر کی محبت میں کھو گئی۔ کیسی عجیب اور کتنی بھرپور محبت۔ عاشق کی محبت کے جوش و خروش کا تو سمندر بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے پھر سے پر مل گئے۔ اس نے ایک بار پھر سب کی

طرف غرور سے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔ جی ہی جی میں صفدر کی باتیں نہ بتا سکنے پر گھٹتی رہتی۔ لیکن ایک دن وہ اپنی ساس کی گالی کے جواب میں صفدر سے جوتے لگوانے کی دھونس جما ہی بیٹھی۔

اس بات پر سب نے مل کر رضیہ کی خوب مرمت کی اور پھر اس کے شوہر نے طلاق دے کر اسے گھر سے نکال دیا' اور صفدر کی کوٹھری کے کھلے ہوئے دروازوں نے اسے اپنی گود میں چھپا لیا۔

عدت کے دن پورے ہونے کے بعد صفدر نے بڑی دھوم سے رضیہ کو بیوی بنا کر سب کے اس خیال پر تھوک دیا کہ وہ تو نکاح سے پہلے ہی چھوڑ دے گا۔ شادی کی خبر سن کر رضیہ کی پرانی ساس اور نندیں کوئلوں پر لوٹتی رہیں اور جانے کیوں اس کا شوہر اپنی ماں بہنوں پر غصے ہو ہو کر سارا دن گھر پڑا رہا۔

الجھ کر رضیہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ پھر صفیہ کو دیکھنے کے لئے کوٹھری سے باہر نکل آئی اور کھڑے ہو کر اسے گیلی مٹی کا گھروندا بناتے دیکھنے لگی۔

زمین سے اب تک بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی اور گھرے سیاہ بادلوں کے ٹکڑے ہوا میں ڈولتے پھر رہے تھے۔ کوارٹروں کی چھتوں پر چڑھی ہوئی عورتیں بارش سے بھیگی ہوئی لکڑیاں اور اپلے اتار اتار کر نیچے پھینک رہی تھیں اور بچے انہیں اٹھا کر کوٹھریوں میں پہنچا رہے تھے۔ گھنے درختوں تلے کھاٹیں پڑی تھیں جن پر بوڑھیاں بیٹھی حقہ گڑگڑا رہی تھیں۔ کوارٹروں کی چھتوں کے اس پار شاندار کوٹھیوں کے اوپری حصے صاف نظر آ رہے تھے۔ سرخ' ہری اور بادامی رنگوں کی دیواروں پر بارش نے دھاریاں بنا دی تھیں۔

رضیہ ذرا دیر تک چپ چاپ کھڑی دیکھتی رہی اور پھر اپنی کوٹھری میں تالہ لگا کر ساتھ کے کوارٹر میں چلی گئی۔ اندر ایسا اندھیرا تھا کہ اسے ایک دم کچھ دکھائی نہ دیا۔ جب ذرا آنکھ ٹھہری تو دیکھا کہ ایک دبلی پتلی عورت پیڑھی پر بیٹھی روٹی کھا رہی ہے۔ "میں نے تجھے تو دیکھا ہی نہیں۔" رضیہ نے بڑی بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں پردہ کرتی ہوں۔" عورت نے نوالہ نگلتے ہوئے جواب دیا۔

"واہ جی پالک کا ساگ' اے بہنا میں تو جب تک پالک کا ساگ نہ کھاؤں چین نہیں پڑتا۔" رضیہ نے جلدی سے نوالہ توڑ کر کھانا شروع کر دیا۔

عورت نے بڑی بیزاری سے اس کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی کھانے پر جٹ گئی۔ یہی تو کُل دو روٹیاں تھیں۔ اس پر حصہ بٹانے آ گئی۔ پنجابی جان پڑتی ہے۔ اس نے سوچا۔ ان لوگوں کو ذرا تمیز نہیں ہوتی۔ ایک تو زبان کے بجائے ہاتھ سے بات کریں۔ اس پر ظلم یہ کہ سارے ہندوستانی کہہ کر پکاریں ——— اس کا بس چلتا تو رضیہ کے ہاتھ سے روٹی چھین لیتی۔ اسے تو سچ پوچھو پنجابیوں سے للہی بغض تھا۔ سارا کچھ چھوڑ کر یہاں پاکستانی بننے آئی لیکن کسی نے نہ مانا۔ رہی ہندوستانی ہی۔

"اری بہنا یہ بچہ کیوں بے سدھ پڑا ہے؟" آدھی روٹی چٹ کر کے رضیہ نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"بخار چڑھا ہے۔"

"ہے ہے اسے کونین کھلا۔ میرا صفدر تو گرمی شروع ہوتے ہی مجھے اور صفیہ کو کونین کھلانے لگتا ہے۔ مچھر کاٹنے کا بخار ہوگا۔" اس نے اٹھ کر بچے کی پیشانی کو چھوا۔

"کون لائے گا کونین' میں تو باہر نکلوں نہیں۔ اس کا باپ صبح صبح کام پر چلا جاتا ہے۔"

"صفدر تو مجھے کبھی پردہ نہیں کراتا۔ کونین میں تو خود لا سکتی ہوں مگر ابھی تو مجھے دکانوں کا بھی پتہ نہیں۔ دو چار دن میں سب معلوم ہو جائے گا۔"

"لو اور کھا لو دو نوالے۔" ہندوستانی کے دل پر اس محبت کا بے حد اثر پڑا۔

"بس بہنا اب نہیں کھانا۔ ہے کیسا تیز بخار چڑھا ہے غریب کو۔ راستہ معلوم ہوتا تو ابھی جا کر لے آتی۔ اب شام کو صفدر آئے گا تو اس سے منگا دوں گی۔"

"وہ لے آئیں گے؟" ہندوستانی نے حیرت سے پوچھا۔

"لے بہنا' میں کہوں کہ صفدر ساری رات ایک ٹانگ سے کھڑا رہ تو کھڑا رہے گا۔" رضیہ ہنس پڑی۔ "کونین کیا چیز ہے۔" وہ جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ "اب جا کر دیکھوں کہ صفیہ کہاں کھیل رہی ہے۔ صفدر کی بڑی لاڈلی ہے۔ آ کر کہے گا کہ اسے چھوڑ کر مزے سے بیٹھی رہی۔ وہ پٹر پٹر کرتی کوٹھری سے باہر نکل گئی۔ اس نے مڑ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ ہندوستانی کے چہرے پر کیسا اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ اس کے میاں نے تو کبھی اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی تھی۔ مزاج کا ایسا شکی کہ بیوی کو کوٹھری سے نکلنے کی اجازت نہ تھی۔

بادل اب بھی جھوم رہے تھے۔ کوٹھیوں کے ساتھ والی سڑک پر کاریں بڑی دھوم دھام سے رواں تھیں۔ بڑی بوڑھیوں نے دوپہر کا سناٹا اور ٹھنڈی ہوا محسوس کر کے اب کھاٹوں پر لیٹ کر اونگھنا شروع کر دیا تھا اور کوارٹر کے باہر بندھی ہوئی شاداں پٹھانی کی بکری جیسے بادلوں کے اندھیرے سے ڈر کر بار بار چیخ اٹھتی۔ رضیہ کوارٹروں کوارٹروں جھانکتی اور باتیں کرتی واپس آ گئی۔

صفیہ کھیلتے کھیلتے تھک کر کوٹھری کے بند کواڑوں سے لگی بڑی میٹھی نیند سو رہی تھی۔ صفیہ کو مسہری پر لٹا کر وہ خود بھی پڑ رہی۔ ایک بار بڑے زور سے بادل گرجا اور پھر بوندا باندی ہونے لگی۔ باہر بچوں کا شور ایک دم بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد سو گئی' اور جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ صفدر آ کر کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا ہے۔

"تو نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں صفدر؟"

"تو تھک کر جو سوئی تھی۔" صفدر نے قمیص کی جیب سے مزدوری کے تین روپے نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔

رضیہ نے جلدی جلدی اینٹوں کے چولہے پر چائے بنائی اور ساسر میں انڈیل انڈیل کر اپنے ہاتھ سے صفدر کو پلانے لگی۔ اسوقت وہ ایسی سرشار نظر آ رہی تھی جیسے کسی نے پوری بوتل پلا دی ہو۔

"دو آنے کی کونین تو لا دے۔" پیالی رکھتے ہوئے رضیہ نے فرمائش کی۔

"کیوں؟" صفدر نے گھبرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور نبض دیکھنے لگا۔

"چھوڑ بھی مجھے کیا ہوا ہے بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ بیچاری ہندوستانی ہے نا، اس کے لڑکے کو بخار چڑھا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ منگا دوں گی۔"

"رہنے بھی دے تجھے کیا۔" صفدر کسمایا اور صفیہ کو سینے سے لگا کر لیٹ گیا۔ وہ اب تک بڑی گہری نیند سو رہی تھی۔

"ہوں، مت لا ——" رضیہ منمنائی —— "وہ کہے گی کہ جھوٹی تھی۔ صفدر تو اس کی بات مانتا ہی نہیں۔ یونہی ڈینگ مارتی ہے۔"

"تجھے جھوٹا کہنے والی کی زبان نہ کھینچ لوں۔" صفدر نے روٹھی ہوئی رضیہ کے گال پر مہین سی چٹکی بھر لی اور پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی لاتا ہوں۔" وہ کوٹھری سے نکل گیا۔

بادلوں کی وجہ سے آج کتنی جلدی شام ہو گئی تھی۔ رضیہ نے لالٹین جلا کر طاق پر رکھ دی اور کھانا پکانے کا انتظام کرنے لگی۔ روز کی طرح آج بھی صفدر گوشت لایا تھا۔ رضیہ کو آج گوشت کی مہک سے نفرت سی ہونے لگی۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی صفدر نے کبھی گوشت کا ناغہ نہ کرایا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ رضیہ گوشت بہت پسند کرتی ہے۔

گوشت پر چپکا ہوا کاغذ صاف کرتے ہوئے رضیہ کو یاد آیا کہ جب اس نے صفیہ کے باپ کو پہلے ہی دن بتایا تھا کہ اس کی بہنوں کے گھر ایک وقت گوشت پکتا ہے تو اس نے بھی گوشت کی بھرمار شروع کر دی تھی۔ گائے کے گوشت کے موٹے موٹے ریشے جب اس کی ساس کے دانتوں میں پھنس جاتے تو تیلی سے کرید کرید کر اسے ہزاروں گالیاں دیتی تھی اور وہ جی ہی جی میں اس کے جلنے پر مزے لیا کرتی۔ مگر پھر ایک دن ایسا بھی آ گیا تھا کہ وہ روزانہ سل پر پودینے کی چٹنی پیس پیس کر روٹی سے کھاتی اور آنسو بہاتی رہتی۔

گوشت دھوتے دھوتے رضیہ نے دہل کر ہر طرف دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر سوچا کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ سب انسان ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔

میلا پانی کوٹھری کے باہر پھینک کر اس نے صفیہ کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ "دیکھ

تیرا ابا آگیا ہے۔ اب ہاتھ منہ دھو لے اور ادھر چولہے کے پاس آ کر بیٹھ جا۔"
رضیہ اب کچھ نہیں یاد کرنا چاہتی تھی۔

صفدر کونین لے کر آیا تو رضیہ گوشت بھون رہی تھی۔ ہانڈی سے ایک بوٹی نکال کر صفدر کے منہ میں ڈال دی۔ "چکھ کیسے مزے کا ہے۔" وہ اٹھلائی اور پھر چولہے کی لکڑیاں آگے کھینچ کر ہندوستانی کے کوارٹر میں چلی گئی۔ لے بہنا' آدھی آدھی گولی کھلائیو۔ صبح تک بخار اتر جائے گا۔ تیرا آدمی ابھی نہیں آیا؟"

"ابھی کہاں' گھومتا پھرتا آئے گا' بیٹھو نا۔"

"لے صفدر آیا بیٹھا ہے' وہ بھلا میرے بغیر چین لے گا——" رضیہ ایک آنکھ میچ کر ہنسی اور بچے کا بخار دیکھ کر چلی گئی۔

پانچ چھ دن گزرے تو رضیہ کو احاطے کے سلسلے میں بہت سی معلومات حاصل ہو گئیں' یعنی کہ یہ احاطہ ایک بڑی نیک بی بی کا ہے۔ انہوں نے غریبوں کے رہنے کے لئے کچی اینٹوں سے کوارٹر بنوا دیے ہیں۔ کرایہ صرف پندرہ روپے مہینے کے حساب سے لیتی ہیں۔ ٹوٹ پھوٹ کرایہ دار کے سر۔ تیز بارش میں لوگ ساری ساری رات جاگ کر چھتوں کی لیپا پوتی کرتے۔ یہاں برسات کی ٹھنڈی ہواؤں سے لطف لینے والوں کی یہی سزا مقرر تھی۔

یہ باتیں سنتے ہی رضیہ نے دو تین ٹوکریاں مٹی کھود کر اپنی مسہری کے نیچے جمع کر لی تھی۔ کیا پتہ کب چھت سے پرنالہ بہنے لگے۔

مہینے کے مہینے مکان دارنی اپنے دو عدد نوکروں کے ساتھ احاطے میں معائنے کے لئے آتیں۔ کرایہ وصول کرتیں اور مزید مرمت کا حکم دے کر چلی جاتیں۔ رضیہ کو انہیں دیکھنے کا بیحد شوق تھا۔ پیلو نے بتایا تھا کہ وہ بیگم بالکل رضیہ جیسی خوب صورت ہیں۔

صبح صبح صفدر روٹی کھا کر اور رضیہ کو پیار کر کے چلا جاتا تو پھر اس پر ایک دم بوکھلاہٹ طاری ہو جاتی۔ صفدر کے جاتے ہی وہ ہندوستانی کے کوارٹر میں چلی جاتی۔ شادی کو ڈھائی سال ہوئے ہیں مگر وہ ایک لمحے کو بھی صفدر کی جدائی برداشت نہ کر سکتی تھی۔

ہندوستانی نے اسے احاطے کی بڑی بڑی ڈھکی چھپی باتیں بتائی تھیں۔ مثلاً "کس کا کس سے عشق چلا تھا۔ کس کس کے شوہر نے داشتائیں رکھ چھوڑی ہیں اور کون کون اپنی بیویوں کی مرمت کرتا ہے۔ یہ بتاتے ہوئے ہندوستانی نے اپنی روز کی مرمت کا حال صفا چھپا لیا تھا اور یہ سب راز کھول کر اس نے رضیہ کو قسم دی تھی کہ کبھی کسی کو بتائے گی نہیں۔ وہ تو اسے اپنی سگی بہن کے برابر سمجھتی ہے۔ اس لئے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ رضیہ نے اس کی ہر بات کو مان لیا تھا۔ اسے تو ہندوستانی کی محبت پر پہلے ہی دن اعتبار آگیا تھا۔ رضیہ گھنٹوں اس سے صفدر کی باتیں کرتی اور وہ خوش ہو ہو کر سنتی رہتی۔ اسے ہزاروں دعائیں دیتی رہتی۔ اب کسی کو دلوں کا حال تو معلوم نہیں ہوتا۔ سب ظاہر پر نظر رکھتے ہیں۔ رضیہ کو شبہ تک نہ ہوتا کہ ہندوستانی اس سے نفرت کرتی ہے۔ یہ محبت تو کونین کی گولیوں سے شروع ہوئی تھی۔ اس محبت میں بڑی کڑواہٹ تھی' بے بسی تھی۔ اگر اسے رضیہ سے اپنے کام نہ لینے ہوتے تو وہ ڈائنوں کی طرح اس کا منہ نوچ لیتی اور اس کی زبان کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دیتی۔ اس نے تو شادی کے اتنے برس گزارنے کے بعد بھی کبھی اپنے شوہر کی زبان سے محبت کا ایک لفظ تک نہ سنا تھا۔

تھوڑے دن اور گزرے تو رضیہ اور صفدر کی محبت احاطے میں مذاق بن گئی۔ عورتیں اسے چھیڑتیں تو وہ بڑی خوش ہوتی' ہمک ہمک کر کہتی۔ "ہاں بھئی' ہے محبت۔ پھر؟" کنواری لڑکیاں بھی چھیڑنے میں پیچھے نہ رہتیں۔ "ماسی تیرا صفدر نہیں آیا؟"

"تبھی تو ماری ماری پھر رہی ہوں۔ اس کے بغیر جی کب لگتا ہے۔" وہ تڑسے جواب دیتی۔ اس چھیڑ چھاڑ میں رضیہ کے دن بڑے مزے سے گزر رہے تھے۔

وہ احاطے میں آکے بڑی خوش تھی۔ پہلے جہاں صفدر نے کوارٹر لیا تھا وہ تو سخت بیزار کر دینے والی جگہ تھی۔ ہر طرف کوٹھیاں' مصروف بیگمیں' فرصت کو ترستے ہوئے نوکر' رضیہ نے لاکھ دوڑ بھاگ کی' مگر کوئی دو منٹ کو بیٹھ کر اس سے باتیں نہ کرتا۔ کوئی نہ سنتا کہ رضیہ پر صفدر مرتا ہے اور وہ دنیا کی خوش نصیب

عورت ہے۔ اسے یہ بیگمیں کیسی عجیب لگتیں۔ اسے ان پر بہت ترس آتا۔ بیچاری پیاسی ٹیٹریاں۔ صفدر نے اسے بہت کچھ بتا رکھا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ یہاں بیویوں کو کوئی نہیں چاہتا۔

گرمیوں کی رات جب صفدر کا اجلا بستر کوٹھری کے باہر لگ جاتا تو وہ لیٹتے ہی ٹرانزسٹر چلا کر اپنے پہلو میں رکھ لیتا تو احاطے کے شوقین مزاج مرد عورتیں اس کی کھاٹ کے گرد جمع ہو جاتے۔ رضیہ بڑی محبت سے عورتوں کو اپنے بستر پر بٹھاتی اور مرد صفدر کی کھاٹ پر ٹک جاتے۔ گانے ہوتے رہتے' مرد آپس میں باتیں کرنے لگتے۔ حکومت کے معاملات' ہونے والے صدارتی انتخاب اور مہنگائی' سب پر اظہار رائے کیا جاتا اور آخر میں تان پیٹ کے دوزخوں کے بھرنے پر ٹوٹتی۔ "ہمیں کیا' کوئی آئے' کوئی جائے' جو آٹا سستا کرے وہی اچھی حکومت کہلائے۔" صفدر بیزار ہو کر بات ختم کر دیتا اور مزے سے گانے سننے لگتا' مگر شاداں پٹھانی کا میاں اکڑا رہتا۔ "نئیں' آٹا جائے اور مہنگا ہو جائے' ام عورت کا حکومت نئیں مانے گا۔ یہ امارا بے عزتی ہے۔ عورت کو اللہ نے چوٹا بنایا ہے۔"

پٹھان کو کوئی جواب نہ دیتا۔ سارا فرمائشی پروگرام اوپر ہی اوپر نکلا جاتا تو سب بوکھلا اٹھتے۔

کبھی کبھی رات کو شاداں کا شوہر لکڑیوں کی ٹال پر سے اپنے دوستوں کو ساتھ لے آتا اور وہ رات گئے تک اپنی زبان میں لوک گیت گاتے رہتے۔ شاداں دوڑ دوڑ کر سب کو گانے کی دعوت دیتی اور قہوہ بنا بنا کر پلاتی۔ رضیہ اس محفل میں کبھی شریک نہ ہوئی تھی۔ اس نے ہندوستانی سے کہا تھا کہ بہنا میں کیوں جاؤں' کیا میرے گھر ریڈیو نہیں' ان کے گانے سے تو میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ ہندوستانی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اب بھلا وہ سچی بات کیسے کہتی کہ اسے تو وہ گانے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کوٹھڑی سے باہر کچھ بھی ہو اسے وہ سب دیکھنے کی حسرت رہتی ہے۔

مگر جب سے رضیہ کے ٹرانزسٹر نے سارے احاطے والوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا' شاداں پٹھانی بھی مارے جلن کے مہینے میں ایک بار گانے کی محفل ضرور

منعقد کراتی۔ رضیہ کی باتیں سن سن کر اب وہ بھی یہ ثابت کرنے پر تل گئی تھی کہ اس کا میاں بھی کچھ کم چاہنے والا نہیں۔ اپنے شوہر کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے وہ رضیہ کا سب کے سامنے مذاق اڑاتی رہتی —— "چاہے روز جوتی کھاتا ہو بات دوسری کرتا ہے۔" ان دنوں تو شاداں کا یہ حال ہوگیا تھا کہ اگر اس کا شوہر اسے مارتا پیٹتا تو وہ اندر سے کوٹھری کے دروازے بند کرلیتی تاکہ باہر کوئی نہ سن سکے۔ وہ بڑی خاموشی سے اپنے شوہر کے ہاتھوں روئی کی طرح دھنک جاتی مگر ہوں تک نہ کرتی۔

آج جب رضیہ ہندوستانی کی کوٹھری میں گئی تو اس نے بتایا کہ شاداں آئی تھی اور اس کا مذاق اڑا رہی تھی اور کہتی تھی کہ چاہے روز جوتیاں کھاتی ہو مگر میاں کی محبت کے ڈھنڈورے پیٹنے سے باز نہیں آتی۔

رضیہ اتنی بڑی بات سن کر قابو سے باہر ہوگئی —— "خود حرامزادی جوتیاں کھاتی ہوگی، اسی لئے کہتی ہے، میرے صفدر نے تو کبھی پھولوں کی چھڑی بھی نہیں چھوائی، ابھی پوچھتی ہوں اس سے۔"

"لو جب سے تم آئی ہو اس کے مار کھانے کا پتہ نہیں چلا، ورنہ ایسی ماریں کھاتی تھی کہ حد نہیں۔ اس کے ماتھے پر جو داغ ہے وہ بھی مار کا ہے۔ آٹھ دس دن پٹی باندھ کر پھری تھی۔"

"ایسا بتاؤں گی اس حرم زادی کو کہ یہ یاد کرے گی۔" رضیہ ایک دم اٹھ پڑی۔

"للہ میرا نام مت لیجیو رضیہ۔ میں نے تو محبت کے مارے تجھے بتادیا ہے۔ تیرے خلاف بات سن کر کلیجہ جل گیا تھا۔" اس نے رضیہ کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی بٹھا لیا۔ "بہن تم صبر کر جاؤ۔ میں نے تو جانے یہاں کتنا جی مارا ہے۔ میں پردہ کیا کرتی ہوں کہ سب مذاق اڑاتی ہیں۔ میری زبان تک کی نقلیں کرتی ہیں۔ بھلا اپنی طرف کا ہے کو ایسا ہوتا تھا۔"

"بہنا میرے کوئٹے میں بھی ایسا نہیں ہوتا۔" رضیہ نے فخریہ کہا۔ اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ ہے کہاں کی۔ تقسیم کے وقت وہ ننھی سی تھی، اس کے گھر میں

بھی کبھی اس قسم کے ذکر نہ ہوئے۔ بس سب کو پیٹوں کی پڑی رہتی۔ ملکوں کو کون روتا۔

ایک ذرا ٹک کر رضیہ پھر کھڑی ہوگئی۔ ”میں اس سے پوچھوں تو بہنا' تیرا نام بھی لوں تو زبان کاٹ لیجیو۔“

”اری کس کس سے پوچھے گی رضیہ۔ ساری عورتیں دل ہی دل میں تجھ سے جلتی ہیں۔ زبان سے کچھ نہیں کہتیں تو کیا ہوا' اور ——“ ہندوستانی چپ ہوگئی کیونکہ رضیہ پوری بات سنے بغیر ہی چلی گئی تھی۔

دوپہر ہو چکی تھی' ہوا بالکل بند تھی۔ عورتیں گھنے درختوں کے سائے تلے پڑی ہوئی کھاٹوں پر لیٹی پنکھا جھل جھل کر اونگھ رہی تھیں۔ بچے ہینڈ پمپ کے پاس کشتیاں لڑ رہے تھے اور ڈونگوں کٹوروں سے پانی اچھال رہے تھے۔

”کہاں چلیں ماسی؟“ پیلو نے ٹوکا۔ وہ اپنی اماں کے پاس بیٹھی کروشیا سے لیس بن رہی تھی۔

رضیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مارے غصے کے کانپ رہی تھی۔ اس نے شاداں کی کوٹھری کے پاس جا کر ہی دم لیا۔ کوٹھری میں تالہ پڑا ہوا تھا اور باہر بندھی ہوئی بکری آنکھیں بند کئے جگالی کر رہی تھی۔ ”وہ کہاں ہے اپنے خصم کی لاڈلی۔ ذرا صورت تو دیکھوں اس کی۔ بہت بڑھ بڑھ کر بولنے لگی ہے۔“ رضیہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ احاطے کی بوڑھی بیوہ درزن نے اونگھتے سے چونک کر پوچھا۔

”بس یہ بتا دے ماسی کہ وہ شہزادی ہے کہاں؟“

”ادھر ہے پرلی طرف' اس بڑے درکھت کے پاس۔“ پیلو نے مزے میں آ کر بتایا۔ وہ رضیہ کے ساتھ ہولی تو دوسری عورتیں بھی جلدی جلدی اپنی کھاٹوں سے اٹھنے لگیں۔

”ہاں تو اب بتا بہنا' میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے جو میرے خلاف الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے۔ کوٹھری کے اندر تیرا خصم تجھے روز جوتیاں لگاتا ہے' میرے صفدر

نے تو مجھے کبھی انگلی بھی نہیں چھوائی۔"

پٹھانی اپنے بچے کو سینے سے لگائے اونگھ رہی تھی۔ اس اچانک حملے سے ہڑ بڑا کر اٹھ گئی۔ سرہانے رکھا ہوا دوپٹہ اٹھا کر سر پر ڈال لیا۔ اس کا منہ چقندر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ "پہلے یہ بتا کون کیتا ہے۔"

"کوئی کہتا ہے؟ تو بتا لاڈو تو نے مجھے کب جوتیاں کھاتے دیکھا ہے؟ تجھے تو سب نے دیکھا ہے۔"

"نئیں بتاتا تو پھرام نے کہا ہے' تیرا آدمی آسمان سے اترا۔ تیرا آدمی آسمان سے اترا ہے جو نئیں مارتا۔ تم جوٹ بولتا ہے!"

"جھوٹ بولتی ہوگی تو۔ جوتیاں کھاتی ہوگی تو۔" رضیہ پٹھانی کے بالوں میں جھول گئی۔ پہلے تو عورتوں نے دونوں کو الگ کرنا چاہا مگر جب وہ نہ مانیں تو کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگیں۔

شروع میں تو دونوں برابر رہیں' مگر پٹھانی پھر پٹھانی تھی۔ اس نے مار مار کر رضیہ کا خوب صورت چہرہ سجا دیا۔ دانتوں سے خون نکال دیا' اور پھر رضیہ خود بخود الگ ہو کر زور زور سے رونے اور چیخنے لگی۔ "دیکھ لو بہنا' میرا منہ سجا دیا ہے۔ سب گواہ رہیو۔ میرے منہ سے خون بہا ہے۔ شام آنے دے صفدر کو۔ وہ گت بنواؤں گی کہ لوگ بھی دیکھیں گے' اری وہ تو میرے حکم پر ناچتا ہے' اور یہ حرام زادی کہتی ہے کہ مارتا ہے۔"

"ارم زادی تم ہوگا' تمارا ماں ہوگا۔" شاداں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ اور رضیہ کی طرف جھپٹی مگر پیلو نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور زبردستی اس کی کھاٹ پر بٹھا دیا۔ پھر وہ رضیہ کو کھینچتی ہوئی اس کی کوٹھری میں لے گئی۔

اب شاداں نے بلک بلک کر رونا شروع کیا تو عورتیں اسے چپ کرانے لگیں۔ مگر وہ کسی طرح چپ نہ ہو رہی تھی۔ شاید اسے خیال آ رہا ہوگا کہ آج رات اسے پھر کوٹھری کے دروازے بند کر کے مار کھانی ہوگی۔ جب وہ کسی سے لڑتی تو اس کا شوہر اسے ضرور سزا دیتا۔ یہاں تو لوگ ذرا سی بات پر سر پھڑوا کر تھانے جانے کو تیار بیٹھے رہتے۔ صرف ایک بار پٹھان نے شان میں آ کر فساد بڑھایا

تھا تو اس کی ساری جمع جتھہ تھانے کے چکروں کی نذر ہو گئی تھی۔ آج تک وہ اپنی حالت سنبھال نہ سکا تھا۔

کوٹھری میں جا کر رضیہ مسہری پر پڑ گئی اور رو رو کر برا حال کرتی رہی۔ صفیہ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر جلدی سے باہر بھاگ گئی۔ پیلو رضیہ کو تھامے اس کے پاس بیٹھی اسے سمجھا رہی تھی۔ اس کا تو یہاں سے اٹھنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ وہ تو یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ صفدر آ کر کیا کرتا ہے۔

"ماسی لالٹین صاف کر کے رکھ دوں؟ شام پڑنے والی ہے۔" پیلو نے پوچھا۔

"کر دے۔" رضیہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تو اس وقت تک کچھ نہ کروں گی جب تک صفدر نہ آ جائے۔" صفدر کے لئے اس کی روح تڑپ رہی تھی۔ اب اسے صفدر ہی تو اس دکھ سے نجات دلا سکتا تھا۔ صفدر ہی نے تو اسے نفرتوں کے جہنم سے نکال کر محبت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بٹھایا تھا۔

پیلو نے لالٹین صاف کر کے کھونٹی پر لٹکا دی —— "اب بس بھی کر ماسی، مت رو۔" پیلو نے اس کی پیٹھ سہلائی مگر وقت گزرنے کے ساتھ رضیہ کی سسکیاں بڑھتی جا رہی تھی۔

پانچ بجے کے قریب صفدر آ گیا۔ پیلو کو دیکھ کر اس نے نظریں جھکا لیں اور سودے کی پوٹلی میز پر رکھ دی۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا کہ رضیہ کی سسکی سن کر ایک دم بوکھلا گیا۔ "کیا ہوا ہے ری؟" وہ تقریباً" چیخ پڑا اور رضیہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "کچھ بول بھی نا؟"

پیلو اٹھ کر کوٹھری کی دہلیز پر بیٹھ گئی۔

"وہ شاداں نے مارا ہے۔" رضیہ نے سوجا ہوا چہرہ صفدر کے سامنے کر دیا۔ "کہتی تھی کہ تو مجھ سے محبت نہیں کرتا، تو مجھے روز جوتیاں مارتا ہے۔ وہ تجھے بدنام کرتی تھی۔ جب میں نے پوچھا تو پھر میری یہ حالت بنائی۔"

"کون ہوتی ہے وہ مارنے والی۔" صفدر اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"سب جلتے ہیں تیری محبت سے، سب ——" رضیہ تڑپ کر روئی۔

"میں مارنے والوں کے ہاتھ نہ کاٹ لوں گا۔" وہ دروازے کی طرف لپکا اور رضیہ کے پکڑنے کے باوجود باہر چلا گیا۔ رضیہ نے حیران پیلو کی طرف دیکھا اور پھر آنسو پونچھنے لگی۔ "دیکھ میں نہ کہتی تھی کہ صفدر سن پائے تو جانے کیا کر بیٹھے۔" کوٹھری کھلی چھوڑ کر وہ صفدر کے پیچھے لپکی۔

"میں جان کو نہیں ڈرتا' پھانسی چڑھ جاؤں گا مگر مارنے والوں کے ہاتھ ضرور کاٹ کے رہوں گا۔" صفدر شاداں کی کوٹھری کے پاس جا کر دھاڑا اور دونوں ہاتھوں سے سینہ پیٹ کر لڑنے کی دعوت دینے لگا۔ احاطے کے سارے مرد اور عورتیں اس کے پاس جمع ہو گئے۔

"اپنا عورت کو روکو' تمارا عورت لڑنے کو آیا تھا' جان کو ام بھی نہیں ڈرتا۔"

"پھر ٹھیک ہے تو آ جا فیصلہ کر لیں۔" صفدر نے شلوار کے پائنچے اوپر اڑس لئے اور پھر جھپٹ کر پٹھان کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

پٹھان کی بھبکی رائگاں گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر سب کی طرف دیکھا۔

"دیکھو بائی' یہ عورت ذات تو روز روز لڑتا ہے مگر ام تم ایک دین کا جاننے والا ہے پھر کس واسطے لڑے۔ ام اپنی بیوی کو سزا دے گا' اور جو ام نے لڑ کر خون کیا تو خدا کا بھی گنہگار ہو گا۔ دنیا والا بھی کہے گا کہ بائی نے بائی کا خون کیا۔" پٹھان نے بڑی آہستگی سے صفدر کا ہاتھ ہٹایا اور پھر ہنسنے لگا۔

"چل چھوڑ صفدر' بھائی جو کہتا ہے' مگر تو اپنی بیوی کو منع کر لے' یوں ہی باتیں نہ بنایا کرے' ہاں۔" رضیہ کا دل پگھل گیا۔

صفدر سر جھکائے اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔

"دیکھو ماسی' میں سچ کہتی تھی نا کہ صفدر اتنی محبت کرتا ہے۔ ابھی جانے کیا کر بیٹھتا۔" رضیہ نے درزن سے کہا اور پھر اس طرح سب کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اب اور جلو۔ پھر وہ بڑے غرور سے قدم اٹھاتی اپنی کوٹھری کی طرف چل دی۔

جب صفدر ہلدی پیس کر رضیہ کے منہ پر تھوپ رہا تھا تو اس وقت پٹھان

شاداں کو اس طرح پیٹ رہا تھا کہ ضبط کے باوجود اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں، اور بند کوٹھری کے باہر کھڑی ہوئی عورتوں کے دل دہلے جا رہے تھے۔

اس وقت پیلو نے سب کو نقلیں کر کر کے بتایا کہ صفدر نے کس طرح رضیہ کو اٹھایا اور پھر اپنی چھوٹی بہن کو سینے سے لگا کر بتایا کہ یوں سینے سے لگا لیا۔ ایسا بے شرم جس کی کوئی حد نہیں۔

احاطے کی ساری عورتوں کی ہمدردیاں شاداں کے ساتھ تھیں۔ رضیہ کی تو صورت سے نفرت ہو گئی تھی سب کو۔ رضیہ کی طرف سے سب کے کلیجے پھٹ گئے تھے۔

دوسرے دن رضیہ کے چہرے کی سوجن اتر گئی اور وہ جیسے سب کچھ بھول بھال کر اور بھی خوش پھر رہی تھی۔ "اری بہنا ساری رات جاگ کر صفدر منہ دیکھتا رہا ہے۔" اس نے ہر ایک کو بتایا مگر کسی نے جواب نہ دیا حالانکہ ان کے تیور یہی کہہ رہے تھے کہ ایک بار سب باری باری اس کا منہ سجانے کی خواہش میں مر رہی ہیں۔ مگر صفدر تو جان سے بھی نہیں ڈرتا تھا، اس لئے کوئی رضیہ کے کیا منہ لگتا۔ ہاں جب وہ چلی جاتی تو پھر سب اس کا مذاق اڑاتیں، گالیاں دیتیں، وہ شاداں کو یقین دلاتیں کہ رضیہ تو عورت ہے ہی نہیں۔ کوئی رنڈی ہے۔ ورنہ عورت تو وہی ہوتی ہے جو مرد کی غلامی کرتی ہے اور جوتیاں کھاتی ہے۔ ایسی باتیں سن کر شاداں کا کلیجہ ٹھنڈا پڑ جاتا۔ وہ ہمک کر ہاں میں ہاں ملاتی۔ "عورت کو خدا نے چھوٹا بنایا ہے۔" جس دن رضیہ سے لڑائی ہوئی تھی، شاداں نے جیسے ہمیشہ کے لئے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ جدھر سے رضیہ گزرتی وہ دوپٹے کے پلو سے آڑ کر لیتی۔

ادھر پیلو دوستی کے پردے میں رضیہ کی تاک میں رہتی۔ صفدر آیا نہیں کہ اس نے کوٹھری کے چکر لگانے شروع کئے۔ "بھائی صفدر ریڈوا لگا۔" دو چار گانے سن کر بھاگ آتی اور پھر سب کو نقلیں کر کر کے بتاتی کہ رضیہ کس طرح اترا اترا کر باتیں کر رہی تھی اور کس طرح مٹک کر چل رہی تھی۔

اب رات جب صفدر ریڈیو بجاتا تو عورتیں رضیہ کے بلانے کے باوجود نہ آتیں۔ کام کا بہانہ کر کے بیٹھی رہتیں۔ رضیہ کو ان کے اس طرح جلنے پر بڑا مزا

آتا- مرد آتے اور صفدر کی کھاٹ پر ٹک کر ریڈیو بھی سنتے اور باتیں بھی کرتے۔

بس ایک ہندوستانی تھی جس سے رضیہ کی دوستی تھی- وہ رضیہ کو دیکھتے ہی سارے کام چھوڑ کر باتیں کرنے بیٹھ جاتی- اب تو رضیہ اپنے پیسوں سے اس کے لئے سستا سا تیل، جوئیں نکالنے والی کنگھی اور بال پنیں بھی لے آئی تھی اور جب اس نے پیسے دینے کی کوشش کی تو رضیہ اس سے لپٹ گئی تھی- "اری بہنا صفدر تو کہتا ہے کہ سب کچھ تیرا ہے- چاہے دونوں ہاتھوں سے لٹا دے- پھر میرا پیسہ تیرا پیسہ نہیں ہوا؟"

اب برسات گزر چکی تھی اور اچھی خاصی سردی پڑنے لگی تھی- دن اتنے چھوٹے ہونے لگے تھے کہ چار بجے سے پرندے درختوں میں بسیرا لینے کے لئے شور مچانے لگتے- کوٹھریوں میں چراغ جل جاتے اور سرشام ہی احاطہ سونا ہو جاتا- اس سناٹے میں کسی کسی وقت ہینڈ پمپ کی ہتھی شور مچاتی اور پھر خاموشی چھا جاتی- صبح جب دھوپ چڑھتی تو مرد مزدوری پر چلے جاتے- عورتیں دھوپ میں آبیٹھتیں اور جب جسم خوب گرم ہو جاتے تو پھر کام کاج میں جٹ پڑتیں- صفدر کے جانے کے بعد رضیہ بھی دھوپ کی تلاش میں سب کے پاس آ جاتی اور گرم چادر میں چھپے ہوئے کھٹے مالٹوں کی پھانکیں چوسنا شروع کر دیتی- "اب چوتھا مہینہ چڑھا ہے-" ——— وہ معنی خیز ہنسی ہنستی "اے بہنا مجھے تو جب تک کھٹی چیز نہ ملے منہ پھیکا پھیکا رہتا ہے- اسی لئے تو صفدر یہ ڈھیر سے مالٹے روز اٹھا لاتا ہے-" وہ سب کو ضد کر کرکے ایک ایک پھانک پکڑا دیتی-

"تو روز حساب بتاتی ہے ماسی- اس خوشی میں سب کو ایک ایک مالٹا کھلا- یہ ایک ایک پھانک کھلاتی ہے-" آخر ایک دن پیلو نے فرمائش کر دی اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کو آنکھ مار کر ہنس دی-

"کھلا دوں گی ری، یہ کون سی بڑی بات ہے؟ کل ہی لے- اللہ قسم صفدر تو مجھ پر روپیہ پیسہ سب قربان کرتا ہے-"

دوسرے دن رضیہ نے سچ مچ پیلو کی فرمائش پوری کر دی- اس نے ساری عورتوں کو خوشامدیں کر کرکے دو دو پیسے والا مالٹا کھلا کر ہی دم لیا-

رضیہ کے جانے کے بعد شاداں بکھرے ہوئے چھلکوں کو دیکھ کر بڑی دیر تک گھنی گھنی گالیاں بکتی رہی اور مالٹے کھانے والیوں نے اپنی صفائی کر دی۔ "جب کوئی اتنی ضد کرے تو کھانا ہی پڑتا ہے۔" پھر وہ سب بھی گالیوں میں شاداں کا ساتھ دینے لگیں۔ بھلا ان میں سے کس کی مجال تھی جو کسی کو مفت میں دو آنے بھی دے دیں۔ مستری کی بیوی بشیراں کی پہلی طلاق صرف اسی لئے ہوئی تھی کہ اس نے اپنے شوہر کی کمائی سے دو روپے نکال کر چپکے سے مائیکے والوں کو دے دیے تھے۔

رات سردیوں کی پہلی بارش ہوئی تھی مگر صبح ہوتے بادل کھل گئے۔ ایسے زور کی سردی ہوئی کہ سب کے دانت بج اٹھے۔ اس پر غضب یہ کہ رضیہ کے کوئٹے سے سردی کی لہر بھی آ گئی تھی۔ آج تو صفدر بھی سردی کے ڈر سے اب تک کام پر نہ گیا تھا۔ چائے کی کئی پیالیاں پی چکا تھا۔

"چل ماسی باہر دھوپ چڑھ گئی ——" صفدر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ پیلو آ گئی۔ "لے، میں ابھی جا سکتی ہوں؟ ذرا بیٹھ، پھر چلوں گی۔"

"چلے گی تو کیا ہو گا، صفدر بھائی کوٹھری بند کر کے چابی تجھے دے جائے گا۔" پیلو دہلیز پر کھڑے کھڑے اٹھلائی۔

"تو جا، نا، میں آ جاؤں گی۔" رضیہ پیلو کو آنکھ مار کر ہنسی۔

"بہت سردی ہے اندر، تو چلی جا، نا۔" صفدر نے پیار سے کہا۔

"واہ تجھے چھوڑ کر چلی جاؤں؟"

"اچھا تو لے میں اب چلا۔" وہ تھیلا اٹھا کر جلدی سے چلا تو پیلو اس سے بچتے بچتے ٹکرا ہی گئی اور پھر دوپٹے کا پلو منہ میں ٹھونس کر ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

رضیہ جب دھوپ میں پہنچی تو پیلو پہلے ہی سب کو بتا چکی تھی کہ آج رضیہ اور صفدر کس طرح باتیں کر رہے تھے اور کیسے چونچلے ہو رہے تھے۔ سب تو خیر دو چار باتیں بنا کر ہی چپ ہو رہے مگر شاداں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، جو اس نے سب کی نظریں بچا کر پلو میں خشک کر لئے تھے —— اور اس نے جیسے ہی رضیہ کو اپنی طرف آتے دیکھا تھا تو پیٹھ موڑ کر اپنے بچے کو دودھ پلانے لگی تھی۔

"اری بہنا، جی بڑا خراب رہنے لگا ہے۔ صفیہ کی دفعہ تو میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اب تو یہ حال ہے کہ کسی طرح چین نہیں پڑتا۔ صفدر ساری رات اٹھ اٹھ کر دیکھتا ہے۔ ذرا ہوں بھی کروں تو دبانے بیٹھ جاتا ہے۔ اور ——"
رضیہ مالٹا چھیلتے ہوئے سب کو بتا رہی تھی۔ مگر کوئی بھی اسے جواب نہ دے رہا تھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ کسی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ بھلا کہاں تک کوئی اس کی یہ باتیں سنتا رہتا۔ اب تو ان سب کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اس کا منہ نوچ کر اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنا چاہتی ہیں۔ ان محبت سے خالی زندگیوں میں رضیہ نے کیسی ہلچل مچا دی تھی۔

رضیہ دیر تک بیٹھی رہی، بولتی رہی اور پھر رنجیدہ سی ہو کر اٹھ پڑی۔ اس نے سردی کی بھی پرواہ نہ کی اور ہندوستانی کی کوٹھری میں جا بیٹھی۔ سب اس سے جلتے ہیں۔ آج یہ خیال رضیہ کے لئے بڑا تکلیف دہ ہو رہا تھا۔ اس طرح تو سب اس سے چھٹ جائیں گے، پھر وہ کس سے بولے گی۔ کس سے صفدر کی باتیں کرے گی۔

ہندوستانی برتن رکھ کر اس کے پاس آ گئی۔ "یہاں تو بڑی سردی ہے بہن۔"

"باہر بیٹھ کر کیا کروں، کوئی بولتا ہی نہیں، سب مجھ سے جلتے ہیں۔ مجھ سے کیوں جلتے ہیں بہنا؟" رضیہ ایک دم رو پڑی۔

"روئیں تمہارے دشمن۔" ہندوستانی اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ "وہ جلیں نہ تو پھر کیا کریں، ان کے گھروں میں تو روز جوتیوں میں دال بٹتی ہے، تم ان کی پرواہ کیوں کرتی ہو؟" اس نے سمجھایا اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی۔ اس وقت اسے روتی ہوئی رضیہ سے واقعی ہمدردی ہو رہی تھی۔

"پر بہنا میں نے تو ان سے نہیں کہا کہ جوتیوں میں دال بانٹو، میرا کیا قصور ہے؟" رضیہ نے کہا تو ہندوستانی چپ ہو گئی۔ شاید اسے کوئی جواب نہ بن پڑ رہا تھا وہ خود بھی تو رضیہ سے جل رہی تھی۔

"اب میں چلی بہنا کام پڑا ہے۔" رضیہ کا جی نہ لگا تو اٹھ کر اپنی کوٹھری میں

چلی گئی اور دیر تک لیٹی رہی۔ آج اسے پھر اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔

آج پھر سر شام بادل گھر کر آ گئے تھے۔ ایسے زور کی گرج چمک ہو رہی تھی کہ دل دہلے جاتے۔ رضیہ نے چولہے میں ڈھیر سی لکڑیاں جلا دی تھیں جو رات گزرنے کے ساتھ بجھتی جا رہی تھیں۔ صفدر اس کے قریب ہی مسہری پر پڑا سو رہا تھا۔ صفیہ اس کے پہلو میں لیٹی تھی۔

جب ذرا گرج کم ہوئی تو رضیہ کو بھی نیند آ گئی مگر ان دنوں تو اسے گہری نیند آتی ہی نہ تھی۔ اب وہ پورے دنوں سے تھی۔ ساری رات جسم ٹوٹتا رہتا۔ کسی کروٹ چین نہ پڑتا۔

وہ ذرا دیر سوئی تھی کہ آنکھ کھل گئی اور پھر اس نے گھبرا کر دیکھا کہ صفدر اپنے بستر پر نہیں ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی مگر دوسرے ہی لمحے صفدر آ گیا۔

"ارے اس سردی میں کہاں گیا تھا تو؟"

"سو بھی جانا، ساری رات پہرہ دیتی رہتی ہے۔" وہ ایک دم تلخ ہو گیا۔

"پیشاب کو گیا تھا۔" اس نے نرمی سے بتایا اور اپنے بستر پر لیٹ کر لحاف میں منہ چھپا لیا۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں رضیہ نے ایک لمحے کو حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سوچا کہ نیند میں ہے، سارے دن کا تھکا ماندہ۔ کیا ہو گیا جو زور سے بول پڑا۔

صبح بادل کھلے ہوئے تھے۔ صفدر بڑے سکون سے بیٹھا صفیہ کے ساتھ چائے پی رہا تھا اور رضیہ بھنورے کی طرح اس کے گرد گھوم رہی تھی —— "صفدر آج تو میرا جی بڑا خراب ہو رہا ہے۔"

"کام نہ کیجیو، آرام سے لیٹی رہیو۔"

"صفدر تو رات اتنی زور سے بولا کہ میں ڈر گئی۔ تو مجھے ڈانٹ بھی سکتا ہے؟"

"میں تو تیری وجہ سے کہہ رہا تھا کہ رات بھر آرام سے سویا کر۔" صفدر کی نظریں جھک گئیں اور وہ تھیلے میں اپنا سامان ڈالنے لگا۔

"وہ تو میں جانتی ہوں، بھلا ویسے تو ڈانٹ سکتا تھا!" وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگی۔

صفدر کے جانے کے بعد اس نے بستر ٹھیک کئے، برتن سمیٹے اور چینی کی پیالیاں دھو کر دیوار گیری پر رکھنے لگی تو جی دھک سے ہو گیا۔ ٹرانزسٹر وہاں نہیں رہا تھا۔ اس پر ڈالنے والا ریشمی کپڑا ایک طرف پڑا تھا۔ اس نے کوٹھری کا کونا کونا چھان مارا مگر ہوتا تو ملتا۔ رضیہ کو برے برے خیال آ رہے تھے۔ کہیں کوئی چرا کر تو نہیں لے گیا۔ اسے بار بار پیلو پر شبہ ہو رہا تھا۔ جب دیکھو کوٹھری میں گھسی چلی آ رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ خود نہ پوچھے۔ صفدر آ کر آپ ہی پوچھ لے گا۔ کیا پتہ وہی لے گیا ہو ٹھیک کرانے کو۔ کل اس سے گھر گھر کی آواز آ رہی تھی۔

کوٹھری بند کر کے وہ دھوپ میں آ گئی—— "بہنا اب تو اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل لگتا ہے۔ صفدر ڈانٹ رہا تھا کہ آرام نہیں کرتی۔ مجھ سے تو نہیں لیٹا جاتا۔" کسی نے اسے جواب نہ دیا مگر پیلو اس کے قریب سرک آئی—— "تو پھر کیوں اٹھ آئی، لیٹی رہ نا، صفدر کے بغیر تیرا جی بھی تو نہیں لگتا۔" وہ ہنسی——

"جانے ٹرانزسٹر کہاں گیا میرا۔ پتہ نہیں صفدر لے گیا ہو گا بنوانے کو۔ کہتا تھا کہ آواز خراب ہو رہی ہے۔"

"چل پھر ٹھیک ہو کر آ جائے گا۔" پیلو اکیلے ہی گٹے کھیلنے لگی۔ "کھیلے گی ماسی؟"

"نہیں مجھ سے جھکا نہیں جاتا۔" وہ بیٹھے بیٹھے آپس میں باتیں کرتی ہوئی عورتوں کا منہ تکنے لگی اور پھر اٹھ کر اپنی کوٹھری میں آ گئی۔

دن رینگ رینگ کر گزرا، آج تو اس سے کام بھی نہ ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ آج تو صفدر آپ ہی کھانا پکا لے گا۔

شام جیسے ہی صفدر آیا تو وہ کراہتے ہوئے اٹھ گئی۔ "ارے تو میرا ٹرانزسٹر لے گیا تھا بنوانے؟"

"ہاں میں لے گیا تھا۔" تھیلا میز پر رکھ کر وہ کرسی پر ہی ٹک گیا۔

"پھر لایا کیوں نہیں؟ میں تو سارا دن فکر کر کے مر گئی کہ کہیں چوری تو

نہیں ہو گیا۔"

"میں نے اسے بیچ دیا' تجھے روپوں کی ضرورت پڑے گی نا۔"

"لے بھلا کیوں بیچ دیا' میں نے جو روپے جمع کر رکھے ہیں۔" وہ ایک دم رنجیدہ ہو گئی۔

"ان روپوں سے تو اپنے بیٹے کا مونڈن کرائے گی' بکرے منگائے گی۔ سارے احاطے والوں کی دعوت کرے گی اور باجے بھی بجوا لیجیو۔" وہ ہنسنے لگا۔ رضیہ کے گال خوشی سے تمتما اٹھے۔

"پھر سارے لوگ دیکھیں گے کہ تو نے کیسی شان سے "حقیقہ" کرایا ہے۔"

"ہوں۔" وہ جوتے اتار کر مسہری پر لیٹ گیا۔

"اب کی بڑا سا ریڈیو خریدیں گے صفدر" وہ چائے بنانے لگی۔

"ہاں!"

"کیا تیری طبیعت خراب ہے؟"

"تھک گیا ہوں۔" اس نے آنکھیں موندے موندے کہا۔

چائے دے کر رضیہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ صفدر نے جلدی جلدی چائے پی اور پھر لیٹ گیا۔ مگر رضیہ اس کا ہاتھ تھامے بولے جا رہی تھی۔ "آج تو تو نے مجھے پوچھا ہی نہیں۔ سچ بڑا خراب دن گزرا ہے۔ پھر تو چلا جاتا ہے تو میری طبیعت اور بھی بگڑنے لگتی ہے۔ اب تو دو چار دن کی چھٹی کر لے' میرا دل گھبرا گیا ہے۔ وہ عورتیں بھی تو اب بات نہیں کرتیں' سب جلتی ہیں تیری محبت سے اور——"

رضیہ چپ ہو گئی' صفدر تو بے خبر سو رہا تھا۔ رضیہ نے اسے ٹھیک سے لحاف اوڑھایا اور پھر صفیہ کو بلانے چلی گئی۔ وہ اب تک باہر بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

"صفدر کو اتنا بے خبر سوتے دیکھ کر رضیہ کھانا پکانے بیٹھ گئی اور جب کھانا تیار ہو گیا تو اس نے صفدر کو جگانا چاہا مگر وہ کسی طرح بھی نہ اٹھا۔ بس ہوں ہوں کر کے پھر سو جاتا۔ رضیہ کو یقین ہو گیا کہ وہ ضرور بیمار ہے۔ صرف اسی کے خیال سے

کچھ نہیں کہہ رہا۔ مارے فکر کے اس کا برا حال ہوا جا رہا تھا۔

صفیہ کو کھلا پلا کر وہ بھی بھوکی ہی پڑ گئی۔ رات بڑی دیر تک اسے نیند نہ آئی کیونکہ صفدر بڑی بے چینی سے کروٹیں بدلے جا رہا تھا۔ رضیہ ہوں ہوں کر کے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اسی عالم میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ خواب میں دیکھ رہی تھی کہ اس کے دروازے پر دو بکرے بندھے ہیں اور وہ صفدر کے بیٹے کو گود میں لئے مسہری پر بیٹھی ہے۔ ایک بار بکرے بڑے زور سے ممیائے تو اس کی آنکھ کھل گئی۔

کوٹھری کے کھلے ہوئے دروازے ہوا کی وجہ سے آپس میں ٹکرا رہے تھے اور باہر اندھیرے میں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ صفدر اپنے بستر پر نہ تھا۔ رضیہ اٹھ بیٹھی۔ "پھر پیشاب کو باہر چلا گیا۔ کہیں سردی لگ گئی تو کیا ہوگا۔ اندر ہی کر لیتا میں صبح صاف کر دیتی۔" وہ باہر اندھیرے میں گھورے جا رہی تھی۔

بیٹھے بیٹھے دیر ہوگئی مگر صفدر نہ آیا تو رضیہ کے دل میں پنکھے لگ گئے۔ رات کو یوں باہر نکل گیا جو کہیں کچھ ہو جائے تو پھر' چور چکار پھرتے ہوتے ہیں۔

صفدر کی تلاش میں باہر جانے ہی والی تھی کہ وہ آگیا دروازے بند کر کے سیدھا اپنے بستر پر چلا گیا۔ "پیٹ میں درد تھا۔ تو کیوں اٹھ گئی۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"رات تو نے کھانا بھی تو نہیں کھایا۔ صبح ڈاکٹر کو دکھانے ضرور جائیو' میں تیرا پیٹ سینک دوں؟" وہ اٹھنے لگی۔

"نہیں' نہیں' تیری طبیعت خراب ہے' سو جا۔" اس نے لحاف میں منہ لپیٹ لیا۔

رضیہ بھلا کیا سوتی۔ ساری رات یونہی بیٹھ کر گزر گئی۔ مگر جب صبح وہ اٹھا تو بڑا بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور پھر جاتے جاتے رضیہ کے گال پر چٹکی لیتا گیا۔ وہ اسے اچھا بھلا دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔ "ہے دو دن طبیعت کیسی خراب رہی۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اس نے جلدی جلدی سب کام بٹورا اور پھر کوٹھری کو تالہ لگا کر دھوپ میں

سب کے پاس جا بیٹھی۔ ٹرانزسٹر بیچنے اور دھوم دھام سے عقیقہ کرنے کی جیسی بڑی خبریں سنانے کو وہ بے چین ہو رہی تھی۔ "اری بہنا' وہ باؤلا تو میرا ٹرانزسٹر بیچ آیا۔ کہتا تھا کہ ان روپوں سے تو اپنے بیٹے کا "حقیقہ" کرائیو۔ سارے لوگوں کی دعوت کیجیو' ریڈیو تو پھر آجائے گا اور کہتا تھا کہ باجے بھی بجوا لیجیو۔" رضیہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اس نے شاداں کی طرف دیکھا جو اس کی طرف سے پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔ کسی پر بھی تو اتنی بڑی خبر کا اثر نہ ہوا۔

"ہے ماسی بیچ ڈالا؟" پیلو نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ اس خبر سے صرف وہی چونکی تھی۔

"ہاں ری' پھر کیا ہوا' دوسرا آجائے گا' اللہ صفدر کو زندگی دے۔"

"واہ ماسی تیرا ریڈوا بھی ہوتا تو مزہ آجاتا۔ کل رات میرا ابا بھی ریڈوا لایا ہے۔ بالکل تیرے جیسا' بغیر بجلی کے چلتا ہے۔ دونوں مل کر بجاتے' خیر اب تو میرا ریڈوا سن لیا کیجیو۔"

"لا مجھے بھی دکھا۔" رضیہ نے شوق سے کہا۔

پیلو دوڑتی ہوئی گئی اور اپنی کوٹھری سے ٹرانزسٹر اٹھا لائی۔ رضیہ نے اسے دیکھا اور پھر جیسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے خود ہی تو اپنے ٹرانزسٹر کو ایک کونے سے کھرچا تھا کہ پہچان رہے۔ کوئی چرا نہ سکے۔

"رضیہ' یہ تو بالکل تیرا جیسا ریڈیو ہے۔" بشیراں نے غور سے رضیہ کی طرف دیکھا۔ وہ ریڈیو گود میں رکھے ایک ٹک سامنے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں تلے دھیرے دھیرے اندھیرا چھا رہا تھا۔ سامنے سے کوٹھریوں کی قطار غائب ہو گئی اور پھر اتنا اونچا گھنا درخت بھی اندھیرے میں ڈوب گیا——"چھوڑ صفدر "حقیقہ" کون کرے۔ بکرے تو مر گئے۔ اب دعوت میں کسے بلانا ہے"——وہ زیر لب اس طرح بول رہی تھی کہ صرف ہونٹ ہلتے محسوس ہو رہے تھے۔

"رات ابا آکر چلائے گا۔ پھر تجھے میں سنواؤں گی ماسی۔" پیلو نے جیسے اس کی گود سے ٹرانزسٹر اچانک اچک لیا اور پھر سینے سے لگائے لگائے اپنی کوٹھری کی طرف بھاگ گئی۔ ساری عورتیں بڑی عجیب عجیب نظروں سے اس کو دیکھ رہی

تھیں۔ پیلو کے جاتے ہی وہ سب مارے ہمدردی کے رضیہ کی طرف سرک گئیں اور ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگیں۔

"صفدر اب تجھ سے کچھ نہیں کہنا۔ اب کوئی تیرے آنے والے بیٹے کو بھی بن باپ کا تھوڑی کرنا ہے" —— رضیہ کے ہونٹ برابر ہلے جا رہے تھے۔

"ہے بیچاری کیسی خوش پھرتی تھی۔ قسم لے لو جو میں اس سے جلتی ہوں" —— اللہ رکھی نے کہا۔

"میں بھی تو یہی کہتی تھی کہ کہیں مرد ایسے ہوتے ہیں! ہے بیچاری!" بشیراں نے پلو سے آنسو پونچھ لئے۔

"اری تو یوں کیوں بیٹھی ہے، کچھ بول نا، ہوش میں بھی آ۔" درزن نے رضیہ کو زور سے ہلایا، تو وہ چونک پڑی اور اجنبی سی نظروں سے سب کی طرف دیکھنے لگی۔ اللہ رکھی، بشیراں اور درزن، سب کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ رضیہ دھیرے سے شاداں پٹھانی کی طرف سرک گئی —— "اری بہنا، اب تو کیوں مجھ سے ناراض ہے؟ اب تو من جا، نا۔ سارا جھگڑا ختم ہو گیا اب تو۔"

رضیہ شاداں کے گلے سے لپٹ کر اس زور سے روئی کہ شاداں بھی سسکیاں بھرنے لگی۔

خدیجہ مستور

آنگن

ٹھنڈا میٹھا پانی

چند روز اور

بوچھار

زمین

کھیل

تھکے ہارے

ISBN - 969 - 35 - 0563 - 8

Rs. 99.00